دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلہ
ماہنامہ
الحق
زیر سرپرستی: شیخ الحدیث حضرۃ مولانا عبدالحق، بانی و مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، پشاور، (مغربی پاکستان)

لۂ دعوۃ الحق
قرآن و سنت کی تعلیمات کا علمبردار
ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

مدیر
سمیع الحق

جلد نمبر : ۸
شمارہ نمبر : ۴
ذی الحجہ ۱۳۹۲ھ
جنوری ۱۹۷۳ء
فون نمبر ۔ دار العلوم ۔ ۴
فون نمبر ۔ رہائش ۔ ۲

ناشر : سمیع الحق استاد دار العلوم حقانیہ ۔۔۔۔۔ مقام اشاعت : دفتر الحق دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک
طابع : منظور عام پریس پشاور ۔۔۔۔ پرنٹر : محمد شریف ۔۔۔۔۔ کتابت : اصغر حسن

مغربی و مشرقی پاکستان سے سالانہ ۸/ روپے ۔ غیر ممالک بحری ڈاک ایک پونڈ ہوائی ڈاک دو پونڈ
فی پرچہ ۷۵ پیسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؕ

نقشِ آغاز

اسلامی آئین کی چند ضروری شرائط

آئینی کمیٹی کے مسودہ پر غور و خوض کرنے اور آئین کو آخری شکل دینے کیلئے قومی اسمبلی کا اجلاس شروع ہو چکا ہے۔ آئینی مسودہ کی تفصیلات چونکہ تا دمِ تحریر ہمارے سامنے نہیں آسکیں اس لئے اس پر رائے زنی کا موقعہ تو نہیں ہے، البتہ پچھلے دنوں حزب اقتدار و حزب اختلاف کے رہنماؤں کے درمیان جو آئینی سمجھوتہ ہوا ہے اور کمیٹی نے مسودہ میں اس کی بنیادی باتوں کو مدِنظر رکھا، اس کی اسلامی اور جمہوری حیثیت پر بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے، مگر آج کی فرصت میں اس کی جمہوری خامیوں کو نہیں بلکہ صرف اسلامی حیثیت پر کچھ عرض کرنا "ضروری سمجھتے ہیں تاکہ مستقل آئین کے سلسلہ میں اس کو نہ صرف ارکینِ اسمبلی بلکہ تمام مسلمان ملحوظ رکھ کر آئین کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا فیصلہ کر سکیں۔ آئینی سمجھوتہ میں یہ بات بڑی حد تک خوش آئند سمجھی گئی ہے کہ ملک کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا۔ ملک کے قوانین قرآن و سنت کے مطابق ہوں گے صدرِ مملکت کیلئے مسلمان ہونے کا (اور ایک حد تک اسکی تعریف کرتے ہوئے) اقرار لازمی ہوگا۔ اس طرح کی بعض دوسری باتیں جنہیں آئین کے اسلامی ہونے کا ضامن سمجھا گیا ہے، بجا طور پر تحسین و تائید کی مستحق ہیں۔ مگر پچھلے دساتیر کیطرح یہاں بھی چند ایسی بنیادی خامیاں دانستہ رکھی گئی ہیں کہ یہ باتیں محض فریبِ نظر بن کر رہ گئی ہیں۔ اور پورے آئین کو یکسر اسلامیت کی روح سے بیگانہ کر دیا گیا ہے۔ اور محض ایک خوشنما عنوان کے پردہ میں اسلامی قوانین و حقوق کا بری طرح مذاق اڑایا گیا ہے۔ اس طرح دستور میں اسلام، خدا اور رسول، قرآن و سنت اور اسلامی اصول کے محض ذکر سے سادہ لوح مسلمانوں کو تو مطمئن کر سکیں گے، مگر مقصد کسی طرح حاصل نہیں ہو سکے گا۔

۱۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ اگر مذکورہ سب باتیں دستور کے دیباچہ یعنی "مملکت کی پالیسی طے کرنے کے رہنما اصول" میں رکھی گئی ہیں، تو ان کی کوئی قانونی پوزیشن باقی نہیں رہ سکتی۔ یہ حصہ قانون کا وہ حصہ ہے جس کی خلاف ورزی کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ اور کسی بڑے سے بڑے غیر اسلامی قانون کو اسلامی قانون کا نام دے کر آپ ملک میں بآسانی نافذ کر سکیں گے۔ اس لئے لازمی ہے کہ ان تمام باتوں کو قانون سازی کے بنیادی ابواب اور طریق کار والے حصہ میں درج کیا جائے تاکہ کسی بھی خلاف ورزی کو عدالت میں چیلنج کیا جا سکے۔

۲۔ بظاہر پارلیمانی نظام میں صرف قومی اسمبلی قوانین کو آخری شکل دیتی ہے، اس صورت میں یہ ضمانت دینا

لازمی ہے کہ کسی وقت اسمبلی اکثریت کے بل پر اسلامی احکامات وتعلیمات کے خلاف کوئی فیصلہ کر دے تو اسکی اصلاح کے متبادل راستے کھلے ہوں۔ مثلاً ہر مسلمان شہری کو یہ حق حاصل ہو کہ اسمبلی کی کسی غیر اسلامی قانون سازی کو ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں چیلنج کر سکے، بغیر اس کے اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے سپرد کرنے کے محض ایک رسمی اعلان سے کوئی چیز اسلامی نہیں ہو سکتی۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ جب بنیادی حقوق کی حق تلفی کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا جا سکتا ہے تو مذہب اور اسلام کے خلاف کسی قانون سازی پر جو نہ صرف ہر مسلمان کی سب سے بڑی حق تلفی بلکہ کروڑوں مسلمانوں کی حق تلفی ہوتی ہے، ہر عدالت کا دروازہ کھلا رہنا اور بھی ضروری ہے۔

۳۔ آئین میں صدر یا گورنروں کو قانون سازی سے پیشتر انتظامی وغیر انتظامی آرڈیننسوں میں بھی اس بات کا پابند کرانا ضروری ہے کہ کوئی حکم یا فرمان کتاب وسنت کے خلاف نہ ہو تاکہ قانون سازی سے پہلے غیر اسلامی آرڈیننس نافذ رہنے کی گنجائش نہ رہے۔

۴۔ آئین میں قانون سازی کیلئے کتاب وسنت کے صرف منفی پہلو کافی نہیں بلکہ مثبت طور پر یہ بھی وضاحت ہو کہ ساری قانون سازی کتاب وسنت کے مطابق ہو گی۔

۵۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ جس طرح صدر کیلئے مسلمان ہونا ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس طرح ان تمام کلیدی مناصب کو بھی اس شرط کا پابند کر دیا جائے، جو کسی نہ کسی صورت اسلامی مملکت اور مسلمانوں کے مفادات، نظم ونسق اور حل وعقد پر اثر انداز ہوتے ہوں، یا کسی بھی طرح تنفیذ احکام اور ولایت عامہ یا ولایت خاصہ کے دائرے میں آتے ہوں کیونکہ اسلام میں کسی بھی غیر مسلم کو ولایت، قضاء اور تنفیذ احکام جیسے امور میں مسلمانوں پر بالادستی نہیں دی گئی لن یجعل اللہ للکٰفرین علی المومنین سبیلاً۔

پارلیمانی نظام میں ان مناصب میں سب سے پہلا نمبر وزارت عظمیٰ کا آتا ہے۔ وزیر اعظم اس نظام میں اختیارات کا اصل سرچشمہ ہوتا ہے اس کا مسلمان ہونا انتہائی لازمی ہے۔ اسی طرح مرکزی وزراء بالخصوص وزیر دفاع وزیر تعلیم، وزیر قانون وزیر خارجہ کا کسی اسلامی مملکت کے نظریات اسکی بقاء واستحکام اور قیام عدل وغیرہ بنیادی مسائل میں اہم ترین حصہ ہے اس لئے ان کا مسلمان ہونا لازمی ہے ــــــ ارکان عدلیہ سپیکر، ڈپٹی سپیکر، الیکشن کمشنر گورنر صوبائی وزراء اعلیٰ کے عہدوں پر غیر مسلم عیسائی یا مرزائی کو متمکن ہونے کا موقعہ دینا بھی کسی اسلامی سٹیٹ کی بھلائی نہیں ــــــ

اسلامی قانون کے مطابق عدل وانصاف کی نگہداشت اور تنفیذ کرنے والی اہم شخصیت قاضی اور جج کی ہوتی ہے۔ اسلام کسی حال میں کسی غیر مسلم کو اس منصب پر فائز ہونے کا حق نہیں دیتا بلکہ اسلام کی اوّلین شرط کے ساتھ

اسلامی علوم، مآخذ قانون پر اس کی اصل زبان عربی میں عبور کو بھی ضروری سمجھا گیا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر افواج کی سربراہی جیسے کلیدی مناصب، جس میں کسی غیر مسلم پر اعتماد کرنا کسی حال میں بھی دانشمندی نہیں کہلا سکتی نہ کسی نظریاتی مملکت میں اپنی تقدیر سے اس طرح کے شرمناک کھیل کھیلنے کو وسیع النظری سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے ہم سمجھتے ہیں کہ ایک ایسے آئین میں جس میں اسلام کو سرکاری مذہب تسلیم کر لیا جائے اور وہ کسی سیکولر سٹیٹ کا آئین نہ ہو، کسی بھی غیر مسلم کو ایسے تمام مناصب پر فائز ہو جانے کی گنجائش نہیں رہنی چاہیئے۔ جبکہ کئی افسوسناک نتائج کا تجربہ بھی ہو چکا ہو۔

۶۔ نہ صرف یہ کہ اسلام ان تمام مناصب کیلئے ضروری شرطِ اہلیت ہونا چاہیئے، بلکہ اسلام کی نگاہ میں چونکہ کسی غیر مسلم کو قانون سازی کا حق نہیں پہنچتا اس لئے اوّلاً تو ارکانِ اسمبلی کے لئے بھی یہ شرط لازمی تھی، مگر "جمہوریت" کے خوشنما پردہ میں جب یہ غیر اسلامی زہر نگلا ہی جارہا ہے، تو کم از کم غیر مسلم ارکان کو "کتاب و سنت کے مطابق قانون سازی" کے بارہ میں رائے اور ووٹ دینا تو کسی حال میں بھی قرینِ عقل و قیاس نہیں، مگر یہاں تو طرفہ تماشا یہ ہے کہ حلفِ وفاداری کے وقت غیر مسلم ارکان بھی "اسلامی نظریہ" کی حفاظت و اشاعت کا حلف اٹھاتے ہیں، جبکہ خود ان کا عقیدہ اور نظریہ اس حلف کا مذاق اڑاتا ہے۔ اس صورت میں غیر مسلم ارکان کے لئے حلف کی عبارت الگ ہونی چاہیئے۔ تاکہ نفاق کی یہ صورت نہ رہے۔

۷۔ جبکہ مسلمان اور اسلام لازمی طور پر ایک خاص مفہوم اور معنی اپنے اندر رکھتا ہے۔ تو ضروری ہے کہ آئین میں مسلمان کی تعریف بھی شامل ہو۔ اگر ہم ایک لمحہ کے لئے مان بھی لیں کہ علماء اس کی لفظی تعبیر میں متفق نہیں ہو سکے۔ تو کیا آپ اسمبلی کے سو ارکان کو الگ الگ کمروں میں بٹھا کر سوشلزم، کمیونزم، مارکسزم یا سیکولرزم کی ایک ایسی تعریف پر متفق کر سکتے ہیں جس کے الفاظ اور تعبیرات میں ایک لفظ کا فرق نہ ہو۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر ان تمام اصطلاحات سے آپ دستبردار کیوں نہیں ہوتے ــــ مگر یہاں تو اسلام کے مفہوم اور مراد میں بحمداللہ کسی قسم کا لفظی اختلاف بھی نہیں بلکہ اسمبلی کے پہلے سیشن میں سب مکاتبِ فکر اور علماء کیطرف سے شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب ایک متفقہ تعریف پیش کر کے اس اجماع اور اتفاق کا مظاہرہ بھی کر چکے ہیں۔ اور وہ تعریف نہ صرف اسمبلی بلکہ آئینی کمیٹی کے مذاکرات میں بھی ریکارڈ میں آچکی ہے ــــ ہمیں خوشی ہے کہ اب اتنی لے دے کے بعد مسلمان کی ایک حد تک تعریف شامل کرنے پر اتفاق ہو چکا ہے۔ مگر اس میں صرف اللہ کی واحدانیت حضورؐ کی ختمِ نبوت اور آخرت کا اقرار کافی نہیں کہ اس طرح مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ نہ تعریف کی جامعیت مانعیت برقرار رہ سکتی ہے۔ مرزائی تو ابھی سے خوشی منا رہے ہیں کہ ہم ختمِ نبوت کے قائل ہیں۔ اور اب تو قانوناً اپنے آپ کو مسلم منوانے کا موقع یہ تعریف فراہم کر دے گی ــــ کتنی ضروریاتِ دین ہیں جن کا سرِ عام مذاق اڑایا جارہا ہے۔ اس لئے

ضروری ہے کہ ختم نبوت کی بجائے واضح اور غیر مبہم الفاظ میں حضورؐ کو آخری نبی مان کر آپ کے بعد کسی دوسرے نبی پہ ایمان کو کفر و اسلام کا خط امتیاز قرار دیا جائے، نیز عقیدۂ آخرت کے علاوہ تمام ضروریات دین از قسم صلوٰۃ و زکوٰۃ، روزہ، حج اور ان کی ضروریات کے متعارف مفہومات پر ایمان لانے کو بھی تعریف کا جزء بنا دیا جائے۔ اور جنہیں ایک حد تک اسمبلی میں علماء کی پیش کردہ تعریف میں سمو دیا گیا ہے۔

۸۔ اب تک تمام دساتیر بشمول ۱۹۵۶ء کے آئین کے یہ ایک فیشن چلا آرہا ہے کہ مغربی اثرات سے بنیادی حقوق کے نام پہ آئین کی لفظی اور رسمی اسلامیت پر بھی چھری پھیر دی جاتی ہے۔ موجودہ آئین میں یہ گنجائش نہیں رہنی چاہیے۔

مثلاً آج کے بنیادی حقوق ہر شہری کو یہ حق دیتے ہیں کہ "وہ کسی بھی مذہب کی پیروی کرے اس پر عمل کرے یا اسکی تبلیغ کرے۔" اسلام کی نگاہ میں یہ صریح ارتداد ہے، مسلمان اسلام کو اختیار کر لینے کے بعد دوسرے دین کو اختیار نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کی سزا بمقتضائے "من بدل دینہ فاقتلوہ" — (الحدیث) قتل ہے۔ آپ اسے ہزار درجہ تنگ نظری سمجھیں مگر قتل مرتد اسلام کا ایک لازمی حکم ہے۔ غیر مذاہب کی تبلیغ کی بھی کسی اسلامی سٹیٹ میں کھلی چھٹی نہیں ہوتی۔ مسیحی مشنریوں اور مرزائی سرگرمیوں کی شکل میں ارتداد کی تبلیغ کا خمیازہ پوری قوم بھگت رہی ہے۔ اس لئے ایسی دفعہ اگر برقرار ہی رکھنی ہے تو بجائے کسی بھی مذہب کے یہ تصریح کر دی جائے کہ ہر شہری کو حق پہنچتا ہے کہ وہ "اپنے مذہب کی پیروی کرے۔" الخ

۹۔ موجودہ بنیادی حقوق میں عموماً بہت سے حقوق کتاب و سنت سے متصادم ہوتے ہیں۔ اگر آپ اسمبلیوں کو قانون سازی میں ان حقوق کے تحفظ کا پابند بنا دیں گے۔ تو کتاب و سنت کے موافق قانون سازی ناممکن ہو جاتی ہے۔ مثلاً اسلام غیر مسلموں پہ مخصوص ٹیکس لگانے کی اجازت دیتا ہے۔ یہ حقوق آپ کو ایسا نہیں کرنے دیتے وہ غیر مسلم کو جج یا مجسٹریٹ بننے کا حق نہیں دیتا مگر شہریوں کے شخصی قوانین اس کا توڑ کرتی ہیں، شخصی حقوق عورت اور مرد کو ہر حالت میں یکساں رکھنا چاہتے ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ حدود اور قصاص جیسے نازک مسائل میں عورت فیصلے دینے کی مجاز نہیں، نہ اسے عدلیہ کا جج بننے کا حق حاصل ہے۔ نہ ایسے مسائل میں اسکی شہادت قانوناً شہادت ہوتی ہے، اور جہاں شہادت معتبر ہے وہاں صریح نص قرآنی کی بناء پر دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہیں، اسی طرح مسلمان کے خلاف کافر کی شہادت بھی جائز نہیں — اسی طرح آپ قانون بنائیں گے کہ مخلوط تعلیم نہ ہو عام مجامع اور تعلیم گاہوں یا رکوں میں مرد و زن کا اختلاط نہ ہو۔ مگر عصری بنیادی حقوق کسی شہری کے ساتھ مذہب، نسل، جنس، وطن کے لحاظ سے اسی قسم کی پابندی اور قدغن لگانے کے روادار نہیں — اس طرح کی بیشمار مثالیں ہیں کہ بے لگام بنیادی

حقوق اسلامی قانون سازی کا راستہ روکتے ہیں ، اور غیر اسلامی باتوں کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ اس لئے بنیادی حقوق کے ساتھ یہ تصریح ضروری ہے ۔ کہ جہاں تک اسلام اجازت دیتا ہو اور کوئی حق اسلام کے عطا کردہ حقوق کے خلاف نہ ہو۔ ہر شہری کے ایسے تمام حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔

۱۰۔ اسلامی قانون بالخصوص اسلامی حدود میں صدر سے لیکر ادنیٰ رعایا تک اس کا پابند ہوتا ہے۔ وہ نبی کریم اور خلفاء و راشدین تک کو اقامت حدود میں رعایت یا امتیاز برتنے کی اجازت نہیں دیتا اس لئے آئین میں اختیار و اقتدار رکھنے والی اونچی سے اونچی شخصیت کو بھی یہ گنجائش نہیں دینی چاہیئے کہ وہ کسی ثابت شدہ شرعی حد یا شرعی سزا کو منسوخ یا معاف کر دے۔

۱۱۔ ایک بات یہ بھی ضروری ہے کہ کسی قانون کے خلاف کتاب وسنت ہونے کی شکایات پر فیصلہ دینے کے لئے سپریم کورٹ کے ایک خصوصی بینچ کی گنجائش آئین میں رکھی جائے اور یہ بینچ ماہر تجربہ کار، خداترس، متدین، متبحر علماء شریعت پر مشتمل ہونا چاہیئے۔ جن کے علم وفضل پر عوام کو اعتماد ہو اور موجودہ قوانین کو اسلام کے مطابق کرنے کے لئے ایک خاص مدت متعین کرتے ہوئے ایک ایسا با اختیار ادارہ بھی قائم کیا جائے جو مذکورہ بلند معیار کے علماء اور جدید قانون کے تجربہ کار ماہرین پر مشتمل ہو۔

۱۲۔ یہ اسلامی آئین کے چند ایک ایسے لازمی خدوخال ہیں، جن کے بغیر نہ تو کوئی آئین اسلامی آئین کہلا سکتا ہے ۔ نہ محض خوشنما اور نظر فریب اسلامیت سے اس ملک کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ دستور بھی اس وقت تک ہمارے امراض کا مداوا نہیں بن سکتا جب تک ہم خلوص، للہیت اور ایمان داری کے ساتھ اسے لیکر اپنی مشکلات کے حل کا ذریعہ نہ بنائیں گے۔

حق تعالیٰ ہماری قومی اسمبلی کو اس نازک ترین مرحلہ پر ایک وفا شعار مسلمان اسمبلی کا کردار ادا کرنے کی توفیق دے اور غیب سے تمام ارکان کی رہنمائی اور دستگیری فرما دے کہ وہ اسلام کے کلمہ جامعہ پر متفق ہو کر اس ملک کی ذلت وپستی کو عروج وسرخروئی سے بدل سکیں — وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

سمیع الحق
۲۲/ ذی قعدہ ۱۳۹۲ھ

مرکزی وزیرِ اطلاعات مولانا کوثر نیازی صاحب کے جواں سال، خلیق اور ملنسار فرزند فاروق نیازی مرحوم کے سانحۂ وفات پر ادارۂ الحق مولانا کے ساتھ شریکِ غم ہے، حق تعالیٰ مرحوم کو مقامِ شہادت اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین

(ادارہ)

تلخیص و انتخاب : ادارۂ الحق

- شیخ الطریقت مولانا مفتی محمد حسن امرتسری رح
- حکیم الاسلام قاری محمد طیب قاسمی مدظلہ
- شیخ التفسیر مولانا احمد علی صاحب لاہوری رح
- شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ

جان کے بدلے جان کی قربانی

ـــــ مولانا مفتی محمد حسن امرتسری رح ـــــ

حضرات! میں چند ہفتوں سے قربانی کے متعلق جس چیز کو رو رہا ہوں وہ عمل قربانی کو نہیں، بلکہ میں عقیدۂ قربانی کو رو رہا ہوں۔ انگریزی اخبارات میں متعدد بار اور مسلسل اس کے خلاف مضامین چھپتے رہے۔ اور میں اپنے احباب سے برابر پوچھتا رہا کہ کیا کسی اخبار نے اس کا کوئی جواب لکھا۔؟ مگر مجھے یہی معلوم ہوتا رہا کہ تمام اخبارات اس کی طرف سے خاموش ہیں۔ جو شخص اس کے خلاف لکھ رہا ہے، اور قربانی کو رسم بد اور فساد فی الارض کہہ رہا ہے۔ کہ قربانی کی بھی ایک رسم بد چل پڑی ہے جسطرح تراویح کی رسم بد چل پڑی۔ یہ شخص بارہ سو برس کے اجماعی عقیدہ کا انکار کر رہا ہے۔ جو عقیدہ ابتدائے اسلام سے لیکر آج تک مسلمانوں کا متفقہ عقیدہ رہا یہ شخص اس کو فساد فی الارض کہہ رہا ہے ـــــ غرض یہ لوگ اس عقیدہ کو مسلمانوں کے دلوں سے نکال دینا چاہتے ہیں۔ لیکن عقیدہ ہی وہ چیز ہے جسکی درستی ہی سے مسلمان مسلمان رہ سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ قربانی ضروری ہے۔ مگر باوجود استطاعت کے اس کو نہ کرتا ہو تو اس شخص کی نجات ہو جائے گی۔ مگر جو شخص ایسا ہو کہ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ قربانی اسراف مال ہے۔ اور بیکار فعل ہے۔ پھر اگرچہ اس عقیدہ کے ساتھ وہ قربانی ہمیشہ کرتا رہے مگر اس خرابیٔ عقیدہ کی بناء پر ابدالآباد تک جہنم میں رہے گا۔ تو میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ قربانی ہر غنی پر واجب اور ضروری ہے۔ ورنہ دائرۂ اسلام میں رہنا ناممکن ہے۔ اور یہ زہر ایسا پھیلا ہے کہ میرے پاس باہر سے بھی خطوط آتے رہتے ہیں ـــــ یہ الفاظ کہ "قربانی بھی ایک رسم بد چل پڑی ہے۔ جسطرح تراویح مسلمانوں میں ایک رسم بد چل پڑی" کفر کے الفاظ ہیں۔ تو غرض عمل و عقیدہ میں بڑا فرق ہے۔ عمل کو ترک کر دینے سے نجات کی امید ہے۔ مگر عقیدہ ترک کر دینے سے نجات ہی نہ ہوگی ـــــ جب عقائد اسلام پر حملہ ہو

تو ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ جسطرح بھی ممکن ہو وہ اسلام کی مدد کرے۔ اور حقیقت میں یہ اسلام کی مدد نہ ہوگی، بلکہ خود اپنی مدد ہوگی۔ اپنی جان کی مدد ہوگی اپنی آخرت کی مدد ہوگی ——۔

ہم پر جو قربانی فرض کردی گئی وہ اسی نسبت ابراہیمی کو زندہ کرنے کے لئے جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "سنۃ ابیکم ابراھیم"۔ تو چونکہ حضرت ابراہیمؑ کی قربانی میں گوشت مقصود نہ تھا بلکہ جان دینا تھا۔ اسی لئے ہمارے لئے بھی حکم ہے کہ قربانی کی جان دینا مقصود ہے۔ جو اصل میں بدل ہے اپنی جان کا۔ یہی وجہ ہے، کہ فقہاء لکھتے چلے جاتے ہیں۔ کہ اگر کسی نے قربانی کا سارا گوشت خود ہی رکھ لیا اور اسکی کھال بھی اپنے ہی استعمال میں لے آیا۔ تب بھی قربانی ہو گئی، دوسرے صدقات تو مال کو ملک سے سے نکالنا مقصود ہے۔ لیکن اس جگہ مال تو ملک میں رہتا ہے۔ تو جب گوشت بھی اسی کی ملک رہا اور کھال وغیرہ بھی اسی کی ملک میں رہی۔ تو آخر اس کے پاس سے کیا چیز نکل گئی، جس کا ثواب ملا۔؟ تو ظاہر ہے کہ صرف قربانی کی جان نکلی ہے۔ اور یہی مقصود ہے قربانی کا۔ اس لئے اسکو دوسرے صدقات پر قیاس کرکے یہ کہنا کہ اتنا گوشت ضائع ہو رہا ہے۔ حماقت ہے۔ کیا جس مال کے خرچ کرنے سے اللہ مل جائیں وہ مال ضائع ہوگا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سو اونٹ قربان فرمائے اور سو اونٹ قربانی فرمانے میں ایک حکمت یہ تھی کہ اگر کوئی شخص کسی کو قتل کردے اور اس سے خون بہا یعنی خون کا بدلہ دیا جائے تو شریعت نے ایک انسانی جان کا خون بہا سو اونٹ مقرر فرمائے ہیں۔ اور اس مقدار پر چاروں اماموں کا اتفاق ہے۔ تو گویا آپ نے سو اونٹ قربانی فرما کر یہ بتادیا کہ قربانی دراصل انسان کی جان کا بدلہ ہے۔ اور یہ سو اونٹ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جان کا بدلہ دیا۔ تو اصل گوشت پوست نہیں بلکہ جان دینا ہے۔ اب جب یہ بات سمجھ میں آگئی۔ اور خدا کرے کہ سمجھ میں آگئی ہو کہ قربانی دراصل جان کے قائم مقام ہے تو اب سمجھئے کہ اگر آپ قربانی کی بجائے صدقہ دیدیں تو کیا صدقہ قربانی کا بدل ہو سکتا ہے، اور کیا یہ صدقہ جان کا بدل ہو سکتا ہے۔؟ کیونکہ آپ نے لاکھ روپے بھی صدقہ دیا آپ کی جان کی قیمت نہیں، کیونکہ اگر کسی شخص کو لاکھ روپیہ اس شرط پر دیا جائے کہ تم اپنی جان دے دو۔ تو وہ ہرگز اس پر راضی نہ ہوگا۔ تو اب خداوند تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ انہوں نے قربانی کو جان دینے کا بدلہ بنا کر بڑا احسان کیا کہ جو اجر و ثواب کروڑوں روپیہ خرچ کرکے بھی نہ ملتا وہ چند روپے خرچ کرنے سے عطا فرما دیتے ہیں۔

اب جو مخالفین کہہ رہے ہیں۔ کہ روپے خیرات کردو۔ کیا کوئی ذی ہوش یہ خیال کر سکتا ہے۔ یہ قیمت اور روپے قربانی کے (یعنی جان دینے کے) برابر ہو جائیں گے۔ اگر کروڑ روپے بھی کوئی شخص خیرات کردے تب بھی قربانی کا ثواب حاصل نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہؓ فرماتے ہیں۔ کہ ہم پر ایسا

سخت دور بھی آیا کہ کئی کئی وقت کھانے کو نہ ملتا تھا۔ صرف چند کھجوروں پر کئی کئی دن گذر جاتے تھے۔ اور بعض اوقات تو صرف گٹھلیاں چوس چوس کر صحابہؓ نے وقت گذارا ہے۔ مگر باوجود اتنی تنگی اور سختی کے بھی قربانی کی گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ قربانی کا روپیہ ان لوگوں کو دیدو۔ حالانکہ ان سے زیادہ اور کون ضرورت مند ہوگا— اور اس سے زیادہ کون سا دور سخت ہوگا—

اس سے معلوم ہوا کہ قربانی ہی کرنا ضروری ہے۔ قیمت یا روپیہ دینا کافی نہیں ہو سکتا۔ یہی راز ہے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے۔ کہ اگر ایک گائے میں چھ حصّہ دار تو قربانی کے حصّے لیں۔ اور ایک حصّہ کوئی شخص گوشت کرنے کو لے لے تو ان چھ آدمیوں کی بھی قربانی نہیں ہوئی۔ کیونکہ قربانی کا مقصود جان دینا ہے۔ جس کا تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے سب کی قربانی بیکار گئی۔ تو اگر گوشت مقصود ہوتا تو سب کی قربانی ہو جاتی۔ اسی طرح جانور میں شرطیں ہیں کہ اندھا نہ ہو لنگڑا نہ ہو، وغیرہ۔ تو اگر گوشت مقصود ہوتا تو یہ شرطیں کیوں ہوتیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ در اصل گوشت مقصود ہے ہی نہیں بلکہ اصل جان دینا ہے۔

اس کے بعد یہ سنیئے کہ قربانی ہر جگہ کرنا ضروری ہے۔ یہ جو کہا جا رہا ہے کہ صرف مکّہ میں ہی قربانی ہو سکتی ہے۔ یہ غلط ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ مدینہ منوّرہ میں کسی شخص نے قبل نماز قربانی کر دی اور آکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی کہ حضورؐ میں نے قربانی کر دی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ قربانی نہیں ہوئی "شاۃ لحم" یہ گوشت کی بکری ہوگئی۔ اور یہ واقعہ مدینہ منوّرہ میں ہوا۔ اس لئے کہ عید کی نماز مکہ معظّمہ میں نہیں ہوتی۔ وہاں پر خدا تعالیٰ نے معاف کر دی ہے۔ کیونکہ ارکانِ حج ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے کہ: فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ تو اس جگہ قربانی کو خدا تعالیٰ نے نماز کے ساتھ جوڑا۔ اس میں پتہ دیا۔ اس بات کا کہ جسطرح نماز کے اوقات مقرّر ہیں اسی طرح قربانی کا بھی وقت مقرّر ہے کہ دسویں تاریخ کو نمازِ عید کے بعد بارھویں کے غروبِ آفتاب تک اس کا وقت ہے۔ اگر بارھویں کے غروب کے بعد یا عید کی نماز سے قبل سَو اونٹ بھی ذبح کئے تو اتنا ثواب نہ ہوگا جتنا اس وقت میں ایک حصّہ کرنے کا، تو یہ عبادت بھی نماز کیطرح ہے۔ کہ جس کا وقت متعیّن ہے مکان متعیّن نہیں۔

قربانی کا ہر جگہ ضروری ہونا یہ ایک ایسی چیز ہے کہ اس کے لئے دلیلیں بیان کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ کہ آج عوام کی دینی حالت اس قدر مضمحل ہوگئی ہے کہ ایسی ظاہر باتوں میں بھی ان کو شبہات پیدا ہونے لگے۔ اصل یہ ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں۔ کہ ان کے ثبوت کے لئے قرآن و حدیث کی ضرورت نہیں پڑتی۔ (اگرچہ اس کا ثبوت قرآن و حدیث میں بکثرت موجود ہے) مثلاً ہم کو اس کا علم ہے کہ زمین پر "بغداد" بھی ایک شہر آباد ہے۔ حالانکہ ہم نے کبھی بغداد کو دیکھا نہیں، مگر چونکہ ساری دنیا اس کے وجود

پر متفق ہے۔ اور جب سے بغداد آباد ہوا ہے۔ اس وقت سے برابر نسلاً بعد نسل ہر شخص اس کے وجود کو تسلیم کرتا چلا آرہا ہے۔ اس لئے ہم کو بھی اس میں کوئی شبہ نہیں ہوتا نہ کبھی اس کے ثبوت کے لئے قرآن وحدیث کی ضرورت پڑی ہے۔ اسی طرح یہ قربانی کا عمل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر آج تک ہر جگہ یہ عمل رہا۔ صحابہؓ نے کس قدر قربانیاں کیں۔ اور تابعین نے لاکھوں کی مقدار میں تو بلا مبالغہ اور ممکن ہے کہ کروڑوں کی تعداد میں قربانیاں کی ہوں۔ علی ہذا تبع تابعین نے، تو جس عمل پر صحابہؓ تابعین تبع تابعین اور امت کے تمام علماء وصلحاء چودہ سو برس سے متفق ہوں وہ آج لاہور میں اگر چند بے دین لوگوں کے نزدیک جو صرف یہیں کی پیداوار ہیں بے کار اور بے اصل قرار پائے —— الغرض یہ کوئی نظری عقیدہ نہیں کہ جس کو دلائل قائم کر کے ثابت کیا جائے۔ بلکہ آفتاب سے زیادہ روشن اور واضح ہے اور چودہ سو برس کے مسلمانوں کا متفقہ تعامل ہے۔ جیسے بغداد کے شہر کی مثال ابھی گذری۔

امام ابو حنیفہؒ قربانی کے ہر جگہ ہونے پر بحث فرما رہے ہیں۔ اسی طرح امام شافعیؒ و دیگر ائمہ اس موضوع کے ہر پہلو کو واضح فرما رہے ہیں۔ اور یہ حضرات پہلی صدی کے لوگ ہیں۔ تو کیا اسوقت سے آج تک کوئی اس حقیقت کو نہ سمجھا جو آج ان چند جدید لاہور کے محققین پر واضح ہوئی ——؟

میں بقسم کہتا ہوں اور میرے پاس قسم سے زیادہ کوئی چیز یقین دلانے کیلئے نہیں کہ یہ لوگ دین کی حقیقت ہی نہیں سمجھے۔ اگر دین کی ہوا بھی ان کو لگی ہوتی تو یوں ٹھوکریں نہ کھاتے۔ دین کی سمجھ پیدا ہوتی ہے علم دین پڑھنے اور نیک صحبت اختیار کرنے سے، مگر آجکل لوگوں کو دین سے صرف غفلت ہی نہیں بلکہ نفرت و وحشت ہے ——۔

اب رہا یہ سوال کہ اس کا دنیا میں کیا نفع ہے ——؟ سو یہ ایسا سوال ہے۔ کہ اس کا جواب تبھی سمجھ میں آسکتا ہے، جسکو یہ سارا نقشہ مستحضر ہو۔ یعنی حاجیوں کا جانا اسکی وجہ سے دل پر چوٹ لگنا دل میں وہاں جانے کی حسرت ہونا جن لوگوں پر یہ کیفیات طاری ہوں۔ ان سے پوچھئے کہ ان کو یہ تشبہ حاصل کر کے کیا کچھ سکون حاصل ہوتا ہے۔ اور جو شخص ایسا ہو کہ جس کے دل پر نہ چوٹ لگے نہ عید کے دن اس کو کوئی خاص اہتمام ہو نہ خوشبو، نہ غسل نہ قربانی تو اس کو ان باتوں کی کیا قدر ہو سکتی ہے۔ یہ تو وہی سمجھ سکتا ہے جس کے دل پر کچھ چوٹ لگی ہو۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

حج زیارت کردن خانہ بود　　حج رب البیت مردانہ بود

(انتخاب از وعظ قربانی)

★

قربانی ـــــ اسلامی اعمال کی رُوح

ـــــ حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیّب قاسمی مدظلہٗ - دیوبند ـــــ

کائنات میں جسطرح مجموعۂ بدن کے لئے مجموعہ روح ہے۔ اسی طرح ہر چیز کی علٰحدہ علٰحدہ روح بھی ہے۔ جیسے آنکھ میں قوتِ بینائی اسکی روح ہے، وغیرہ۔ اسی طرح سارے اعمالِ شرعیہ کی ایک روح ہے۔ اور پھر ہر عمل کی علٰحدہ علٰحدہ روح ہے۔ اور اس روح کا نام تقویٰ ہے۔ چنانچہ قربانی کے متعلق ارشاد ہے:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ۔

خدا تعالیٰ کو قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ ولیکن تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

ـــ تو قربانی کی روح بھی تقویٰ ہے، سو اگر کوئی صاحب یہ کہے جب قربانی سے تقویٰ مقصود ہے۔ تو قربانی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بلکہ تقویٰ اختیار کر لو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر سارے اسلام کو چھوڑ کر بس تقویٰ ہی اختیار کر لو۔ کیونکہ روزہ کے متعلق ارشاد ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ

تم پر روزوں کا حکم ہوا، جیسے تم سے اگلے لوگوں پر حکم ہوا تھا شاید کہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔

تو روزہ کا حاصل بھی تقویٰ ہی ہے۔ نماز کے متعلق ارشاد ہے کہ:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ۔

نماز بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

جس کا حاصل تقویٰ ہی ہے۔ لہٰذا نماز و روزہ بھی چھوڑ دیئے۔ پھر ارشاد ہے کہ:

ليس البران تولوا وجوهكم قبل المشرق والمغرب ولكن البرّ من آمن بالله واليوم الاخر والملٰئكة والكتٰب والنبيّن واتى المال على حبه ذوى القربٰى واليتٰمى والمسٰكين وابن السبيل والسائلين وفى الرقاب واقام الصلٰوة واتى الزكٰوة والموفون بعهدهم اذا عاهدوا والصٰبرين فى الباساء والضرّاء وحين البأس اولٰئك الذين صدقوا واولٰئك هم المتقون۔

مشرق اور مغرب کی طرف منہ کرنا نیکی نہیں، ہاں نیکی یہ ہے کہ جو اللہ اور قیامت کے دن اور ملائکہ اور کتابوں اور نبیوں پر ایمان لائے اور اس کی محبت پر مال دے رشتہ داروں یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوالیوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور جو لوگ اپنے عہد پورے کریں اور تنگی و سختی میں صبر کرنے والے یہی لوگ سچے ہیں۔ اور یہی متقی ہیں۔

غرض سارے اسلام کا حاصل تقویٰ نکلا۔ اس لئے سب کو چھوڑ کر بس تقویٰ اختیار کر لیجئے لیکن بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ جسطرح ہر چیز کی روح علٰحدہ ہے۔ اسی طرح ہر عبادت کا تقویٰ جداگانہ ہے۔ تو جو تقویٰ گوشت پوست کے ذریعہ پہنچتا ہے، اور حاصل ہوتا ہے۔ وہ کسی دوسری عبادت صدقہ وغیرہ سے کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ مثلاً زید کی روح کو گدھے کے قالب میں اگر منتقل کر دیا جائے تب بھی وہ زید نہ بنے گا بلکہ وہ گدھا ہی رہے گا۔ اسی طرح صدقہ صدقہ ہی رہے گا۔ قربانی کا قائم مقام اسے کیسے کیا جا سکتا ہے۔ تو دنیا میں تو بغیر صورت کے چارہ نہیں اس لئے قربانی کرنا ہی پڑے گی۔ ہاں آخرت میں پہنچ کر آپ قربانی نہ کریں کیونکہ وہاں صورت ضروری نہیں، لیکن اگر دنیا میں آپ نے اعمال کی صورت کو ترک کر دیا تو یقین رکھئے کہ آپ نے اس کی روح کو بھی فنا کر دیا، اسی لئے نبی کریمؐ کا ارشاد ہے کہ:

الایمانُ سِرٌّ والاسلامُ علانیۃٌ　　ایمان پوشیدہ چیز ہے اور اسلام ظاہر۔

اور چونکہ قربانی کا قائم مقام صدقہ یا اور کوئی عبادت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے نبی کریمؐ کا ارشاد ہے:

ماعملَ ابنُ آدمَ من عملٍ یومَ النحرِ احبَّ الی اللّٰہ من اھراقِ الدّمِ۔　　بقرعید کے دن سب سے زیادہ محبوب قربانی ہی ہے۔

تو اس روز سوائے اس عمل کے دوسرا عمل کیسے اس کے قائم مقام ہو سکتا ہے۔

• ذبح کا اصل مقصد جان کو پیش کرنا ہے۔ چنانچہ اس سے انسان میں جانسپاری اور جاں نثاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی اسکی روح ہے تو یہ روح صدقہ سے کیسے حاصل ہوگی۔ کیونکہ قربانی کی روح تو جان دینا ہے۔ اور صدقہ کی روح مال دینا ہے۔ پھر اس عبادت کا صدقہ سے مختلف ہونا اسی طرح بھی معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ کا کوئی دن متعین نہیں، مگر اس کے لئے ایک خاص دن مقرر کیا گیا ہے۔ اور اس کا نام بھی یوم النحر اور عیدالاضحیٰ یعنی قربانی کا دن رکھا گیا۔ جہاں تک قربانی کے مسئلہ کا تعلق ہے۔ تو یہ سلفاً خلفاً ایسی ہی ہوتی چلی آئی ہے۔ انبیاء کا بھی اور امت کا بھی اس پر اجماع ہے۔ انبیاء بنی اسرائیل میں سب کے یہاں قربانی تھی۔ ائمہ کرام کا بھی اس پر اجماع ہے، یہ اور بات ہے کہ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابو یوسف ان سب کے یہاں قربانی سنت ہے، امام ابوحنیفہ وغیرہ کے نزدیک واجب ہے۔ یہ اس کے حکم میں اختلاف، اور ائمہ کے حقائق ہیں۔ مگر قربانی کی مشروعیت میں سب متفق ہیں۔ اور یہ اگر کوئی غیر شرعی عمل ہوتا تو احادیث میں اس کی صفات وغیرہ کیوں بیان کی جاتیں ——— ؟ چنانچہ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ ہم کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ———:

نُستَشرِفُ العینَ والاُذُنَ وَاَن لّا　　ہم قربانی کی آنکھ اور کان کی خوب دیکھ بھال

نُضَحِّيْ بِمُقَابَلَةٍ وَلَا مُدَابَرَةٍ وَلَا شَرْقَاءَ وَلَا خَرْقَاءَ ۔ کیا کریں. ہم نہ قربانی کریں۔ ایسے جانور کی جس کا کان آگے سے کٹا ہوا ہو اور نہ جس کا کان پیچھے سے کٹا ہوا ہو اور نہ جس کا کان چرا ہوا ہو اور نہ جس کے کانوں میں سوراخ ہو ـــــ

اور اس کے علاوہ بھی بعض اوصاف مذکور ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کے احکام صدقہ سے بالکل جداگانہ ہیں۔ اس لئے اس میں صدقہ کے احکام سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ پھر ساری امت آج تک بلا اختلاف اس عمل کو کرتی چلی آئی ہے۔ اور تعامل امت سب سے بڑی دلیل ہے۔

ایک اشکال کا جواب اس جگہ یہ اشکال کہ قربانی کرنے سے جانور ختم ہو جائیں گے ۔ سو اوّل تو یہ خیال ہی غلط ہے۔ کیونکہ روزانہ جو لاکھوں جانور بطور ذبیحہ کے کاٹے جاتے ہیں، عید کے دن وہ نہیں ذبح ہوتے ۔ اسطرح کچھ معمولی سا فرق پڑتا ہوگا۔ جو کسی طرح بھی قابلِ اعتبار نہیں۔ پھر اس روز بعض ایسے لوگوں کو بھی گوشت پہنچ جاتا ہے۔ جو سال میں ایک آدھ دفعہ ہی کھا سکتے ہیں۔ پھر ان کی ساری کھالیں بھی غربا و مساکین ہی میں تقسیم ہوتی ہیں۔ غرض بہت سے منافع اس سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جو روپیہ قربانی میں صرف ہوتا ہے۔ اس کو مہاجرین وغیرہ کی امداد میں صرف کیا جائے تو بیشک مہاجرین کی امداد ضروری ہے، مگر ہر کام کے لئے اسلام کے گلے پر کیوں چھری چلتی ہے، کچھ اپنی خواہشات نفس پر بھی تو چھری چلایئے۔ اور غیر شرعی اخراجات کو بند کر کے مہاجرین کی امداد کیجئے۔ مثلاً سینما ہے، شراب ہے، اور دوسرے فضول اخراجات ہیں۔ حاصل یہ کہ اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ جس طرح کائنات کی ہر چیز میں ایک صورت ہے۔ اور ایک روح اسی طرح اعمالِ شرعیہ میں بھی ایک روح ہے۔ اور جیسے وہاں ہر صورت کی ایک خاص روح ہے۔ جو دوسری صورت میں نہیں آسکتی، اسی طرح یہاں بھی ایک کی روح دوسرے میں نہیں آسکتی۔ سو اب سمجھئے کہ سارے اعمال شرعیہ کا مقصود تقویٰ ہے۔ مثلاً نماز سے عاجزی و انکساری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ روزہ سے تزکیہ نفس کی صورت میں جہاد سے شجاعت کی صورت میں صدقہ سے انفاق مال کی صورت میں اور قربانی سے جاں نثاری کی صورت میں تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ اب اگر آپ نے قربانی کی بجائے صدقہ کیا تو صدقہ سے جاں نثاری کا تقویٰ کیسے حاصل ہوگا۔ کیونکہ صدقہ کا تقویٰ تو اور طرح کا ہے۔ اسی طرح اگر آپ نے قربانی کی بجائے نماز پڑھ لی تو نماز سے عاجزی اور بندگی کا تقویٰ تو ملا مگر قربانی کا تو نہ ملا۔ پس اگر کوئی شخص قربانی نہ کرے اور صدقہ دیدے تو قیامت کے روز اس کو اس صدقہ کا ثواب مل جائے گا۔ مگر قربانی کا مطالبہ باقی رہے گا۔ اور یہ سوال ہوگا کہ قربانی کیوں نہیں کی۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی نماز تو پڑھتا رہا اور روزہ نہ رکھا تو روزہ کا مطالبہ ہوگا کہ کیوں نہ رکھا تھا ـــــ (انتخاب از "مسئلہ قربانی" وعظ)

بنیاد ابراہیمی پر قصرِ شریعتِ محمدی کی تعمیر

شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری رحمہ

قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ نسلِ انسانی کا بیج جب سے سطح دنیا پر بویا گیا ہے اسی وقت سے یہ مبارک رسم قائم ہوئی ہے۔

قولہ تعالیٰ واتلُ علیھم نبأ ابنیْ اٰدمَ اذ قرّبا قربانًا فتُقبّلَ من احدِھما ولم یُتقبّلْ من الاٰخر۔

ان لوگوں کو آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا واقعی قصہ سنا دے۔ ان دونوں نے قربانی کی پھر ایک کی قبول ہوئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔ (انتہیٰ)

ابراہیمی قربانی اور اس کے نتائج حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کو ذبح کر رہا ہوں۔ انبیاء علیہم السلام کے خواب الہام الٰہی ہوتے ہیں۔ اس لئے اس خواب کو حکم الٰہی سمجھ کر بیٹے سے استصواب فرمایا۔ بیٹے نے عرض کیا، اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کیجئے، مجھے خدا تعالیٰ کے فضل سے آپ صابر پائیں گے۔ اس گفتگو کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام صاحبزادے کو ذبح کرنے کے لئے لے گئے، جب ذبح کرنے کی غرض سے بیٹے کو لٹایا اس وقت اللہ تعالیٰ کیطرف سے آواز آئی (اے ابراہیمؑ) تو نے اپنے خواب کو سچا کر دکھایا۔ اور اللہ تعالیٰ نے بیٹے کے عوض ایک مینڈھا عطا فرمایا جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبح کیا۔ جب حصولِ رضا الٰہی کے لئے بیٹا ذبح کرنے کو تیار ہو گئے تو اپنی جان قربان کرنے میں انہیں بطریق اولیٰ کوئی دریغ نہ تھا۔ جب جان اور اولاد قربان کرنے کے لئے تیار تھے تو مال قربان کر کے خدا تعالیٰ کو راضی کرنے میں انہیں کیا عذر ہو گا۔ جب ان کے ہاں جان اولاد اور مال رضائے الٰہی کے مقابلے میں کوئی چیز نہ تھا۔ تو وہاں حبّ وطن محبتِ الٰہی کا کب مقابلہ کر سکتی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ کی رضاء حاصل کرنے میں جان اولاد کی پرواہ نہیں کرتے تو اعزّہ و اقرباء کے تعلقات انہیں دروازہ الٰہی سے کب ہٹا سکتے ہیں۔ جب ان کی جان اولاد اور اعزّہ و اقرباء اس درِ یتیم (رضاءِ الٰہی) پر قربان ہو چکے ہیں۔ تو حبّ بقیہ احبابِ دنیا انہیں کب یادِ الٰہی سے غافل کر سکتی ہے۔ جب رضاءِ الٰہی انہیں جان اور اولاد سے زیادہ عزیز ہے تو کوئی تجارت و زراعت یا صنعت و حرفت ان کا دل کب لبھا سکتی ہے۔

تجدیدِ ملّتِ ابراہیمی سید المرسلین خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام دراصل ملّتِ ابراہیمی کے مجدّد ہیں۔

وجاھدوا فی اللہ حقّ جھادہٖ ھو اجتبٰکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج۔ ملّۃ ابیکم ابراہیم ھو سمّٰکم المسلمین۔ (سورہ حج رکوع نمبر ۱۰ پ ۱۷)

اور اللہ کے کام میں خوب کوشش کیا کرو جیسا کوشش کرنے کا حق ہے اس نے تم کو (اور امتوں سے) ممتاز فرمایا۔ اور (اس نے) تم پر دین کے احکام میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی تم اپنے باپ ابراہیمؑ کی (اس

ملت پر (ہمیشہ) قائم رہو، اس (اللہ) نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے۔

چونکہ شفیع المذنبین رحمۃ للعلمین بنیادِ ابراہیمی پر قصر شریعت محمدی تعمیر کرنے کے لئے مبعوث ہوئے تھے، اس لئے آپ نے بھی اپنی امت کو حصول رضاء الٰہی کی خاطر قربانی کی یاد تازہ کرائی، تاکہ امتِ محمدیہ کے ہر فرد سے ابراہیمی خوشبو آئے اور ہر کلمہ گو کا نورِ ایمان ابراہیمی نور سے مشابہ ہو جائے۔ مسلمانوں کا فرض ہے۔ کہ قربانی کرتے وقت جذباتِ ابراہیمی کا خیال رکھیں۔ دل کے انہی پاکیزہ جذبات کا نام تقوٰی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب و مقبول ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

لن ینال اللہ لحومھا ولا دماءھا ولکن ینالہ التقوٰی منکم۔ — اللہ تعالیٰ کے ہاں قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ اس کے ہاں (اس) تقوٰی کی قدر و قیمت ہے۔ (جو قربانی کرنے والے کے دل میں حاصل ہوتی ہے۔)

بفضلہ تعالیٰ امتِ محمدیہ دعوٰی سے کہہ سکتی ہے کہ شریعتِ محمدیہ کے ہر حکم میں دین و دنیا، دنیا اور آخرت کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ ادہر خدا تعالیٰ راضی ہو جاتا ہے۔ تو ادہر دنیا سنور جاتی ہے۔ ادھر آخرت کی نجات کا سرٹیفکیٹ مل جاتا ہے۔ تو ادھر دنیا کی ذلتوں سے انسان رہائی پا جاتا ہے۔

پیغام فتح اسلام | اگر مسلمان عید قربان کو جذباتِ ابراہیمی کی یاد تازہ قرار دیں اور ہر سال شمع رضاء الٰہی پر پروانہ وار قربان ہونے کے لئے دل و جان ظاہر و باطن سے تیار رہیں۔ تو مالک الملک ذو الجلال والاکرام عز اسمہ و جل مجدہٗ ان کی پشت پناہ ہوگا۔ پھر ایسے سر فروش فدایانِ اسلام کی جماعت جس میدان میں قدم رکھے گی۔ خدا تعالیٰ ان کی جماعت کے لئے زمین و آسمان کے لشکر بھیج دے گا۔ پھر یہ دنیا میں چالیس کروڑ نہیں چالیس سو بھی ہوں گے تو ہر میدان میں فتح و نصرت کا سہرا انہیں کے سر ہوگا۔ دنیا میں کوئی قوم ان کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکے گی۔ جو قوم مقابلہ میں آئے گی منہ کی کھا کر جائے گی۔" (انتخاب از "فلسفہ عید قربان")

★

قربانی — جان کے بدلے جان کا فدیہ

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہٗ

آج کے دن دنیا کے تقریباً ایک ارب مسلمان جب قربانی دیتے ہیں تو اسی نکتہ پر غور کرنا اور اسی حکمت کو ملاحظہ رکھنا ہے کہ ہم اپنے جد امجد حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سنت تازہ کر رہے ہیں۔ اور ایک سبق دہراتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کا سبق ہے۔ ہم اور آپ بھی ایمان کا دعوٰی کرتے ہیں۔ ایمان کو ہم نے بس یہی سمجھ رکھا ہے کہ مسلمان کے گھر پیدا ہوئے تو مسلمان ہیں۔ اور بس جیسا کہ بیری کا تخم بویا تو بیری نکلے گی لیکن

(باقی صفحہ ۲۰ پر)
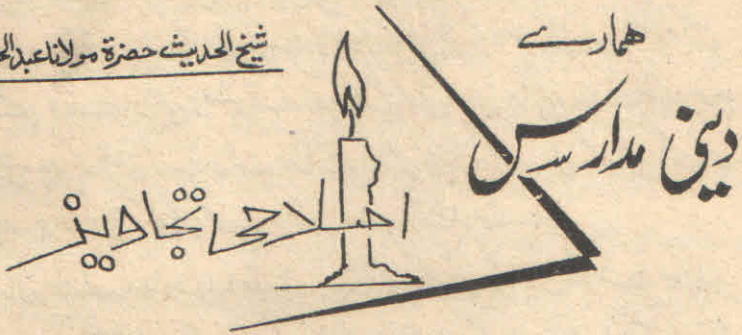
شوال میں دینی مدارس کے نئے تعلیمی سال کا آغاز ہو چکا ہے. اسی مناسبت سے ہم یہاں حضرت شیخ الحدیث مدظلہ کا ایک مضمون شائع کر رہے ہیں، جو مدیر البلاغ کراچی کے ایک سوالنامہ کے جواب میں لکھا گیا تھا. اور البلاغ میں شائع ہوا تھا۔ " ادارہ "

★

موجودہ دینی مدارس کی زبوں حالی اور کماحقہ، موثر و مفید نہ ہونے کے بارے میں آپ کے تاثرات صحیح ہیں۔ اور یہ معاملہ پورے طبقۂ علمی کے لئے غور و فکر کا مستحق ہے، میں بوجہ ضعف و علالت و کثرتِ مشاغل کے اس مسئلہ پر پوری روشنی نہیں ڈال سکتا۔ ماہنامہ الحق نے اسی ماہ (نومبر) کے پرچہ میں آپ کے خیالات کی تائید میں اداریہ لکھا ہے۔ اور اس سلسلہ میں الحق آئندہ بھی باہمی تعاضد و تعاون سے دریغ نہ کرے گا۔ جواب میں مختصراً گذارش یہ ہے کہ :

مدارس کے اصلاح اور مردم خیز ہونے کے لئے اوّلین شرط تصحیح نیت ہے کہ اربابِ مدارس، مدارس قائم کرنے، اس کو چلانے اور اساتذہ و طلبہ اپنے تمام تر تعلیم و تعلم کی غرض اور مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضا اور آخرت کی فلاح و سعادت سمجھیں اور ارشادِ ربّانی ؛ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدّین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم۔ کو ہمہ وقت منظورِ نظر رکھیں۔ دینِ محمدی پر خود عمل مقصود ہو اور دنیا کی ظلمتوں میں نورِ اسلام پھیلانا مطمحِ نظر ہو۔ اگر طلبہ و اساتذہ ، کنتم خیر امۃٍ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر۔ کا مصداق ہوں۔ تفقہ فی الدین اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مظہر ہوں۔ اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم وانتم تتلون الکتاب۔ کا مصداق نہ ہو تو پوری

امت پر اس کے نہایت بہتر اثرات مرتب ہوں گے۔ اس سلسلہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: العلماء ورثۃ الانبیاء۔ منجملہ جوامع الکلم ہے کہ مقام و مرتبت کی بلندی اور ذمہ داریوں کی نزاکت، کا سارا نقشہ اس میں آجاتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ ارباب مدارس کو تعلیمی معیار کا انتہائی اہتمام کرنا چاہیئے اور ہمہ وقت، اس کی درستگی کی فکر لازمی ہے۔ جن مدرسین کو تدریس کے لئے رکھا جائے، فی الواقع وہ متعلقہ علوم کے پورے اہل ہوں متعلقہ کتابوں کے پورے ماہر ہوں، درسیات میں رسوخ اور عبور ہو۔ محنتی اور فرض شناس ہوں اور یہ جذبہ ہو کہ طلبہ کتاب دانی اور فن میں واقفیت بلکہ مہارت حاصل کریں، وہ محض ملازمت کی خاطر ڈیوٹی پوری نہ کریں بلکہ سلف کا ذوق وشوق محنت اور شغف ان کی نگاہ میں رہے۔

تعلیمی معیار کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ طلبہ کا امتحان داخلہ لیا جائے اور استعداد کے موافق کتابیں دی جائیں۔ شرح جامی کا مقتضی اگر نحو میر کے لائق ہے تو اسے قطعاً ترقی نہ دی جائے۔ اس سلسلہ میں کسی سفارش منت سماجت اور لجاجت کا لحاظ نہ ہو۔ اور یہ چیز تب ممکن ہے کہ تمام اہل مدارس اس چیز پر اتفاق کریں مگر افسوس کہ مدارس تکثیر سواد کی کوشش کرتے ہیں۔ تمام مدارس کے اصلاحی اور انتظامی قواعد و قوانین کے مؤثر ہونے کے لئے صرف اس معاملہ میں باہمی تعاون اور قوانین کی رعایت ضروری نہیں بلکہ ہر معاملہ اور اصلاحی قدم میں اگر دیگر مدارس اتفاق نہ کریں تو بہتر ثمرہ اور نتیجہ ظاہر نہیں ہو سکے گا۔ طلبہ جب ایک دروازہ بند دیکھتے ہیں تو سو دروازے کھلے پاتے ہیں۔ تعلیمی اور تربیتی پابندیوں اور بندھنوں میں جکڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ اس سلسلہ میں مدارس کو اجتماعی فوائد اور باہمی معاہدوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ تعلیمی سال کے دوران سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ امتحان بے حد ضروری ہیں۔ ان امتحانات کے لئے طلبہ کی تیاری اور پھر امتحانات کے سارے سلسلہ کو محض رسماً نہیں بلکہ پورے احتساب اور مسئولیت کے ساتھ انجام دینا چاہیئے۔ منتظمین مدرسہ تعلیمی سال کے دوران کتاب کے مقروءۃ اور مقررہ نصاب پر بھی نگاہ رکھیں تاکہ سال کے مختلف حصوں میں تدریسی مقدار کا توازن قائم رہے۔ نیز اساتذہ دوران درس میں بھی طلبہ سے تقریراً امتحان لیتے رہیں۔ تاکہ مختلف الاستعداد طلبہ کا اندازہ لگا کر ان کی طرف حسب ضرورت توجہ دے سکیں۔۔۔۔۔

فنی رسوخ اور پختگی کے لئے جیسا کہ پہلے بھی رواج رہا ہے، مناسب ہے کہ طلبہ کو ہر فن کی بنیادی کتابوں کے متون حفظ کرا دیئے جائیں، کافیہ، شافیہ، سلم، حسامی وغیرہ متون پچھلے دور میں طلبہ کو یاد کرائے جاتے تھے۔ جس سے ذہن کو جلا اور علمی صلاحیت اور نشو و نما بہتر طریقہ پر ہو جاتی تھی۔ مگر توجہ صرف

حفظ پر نہ ہو بلکہ فہم و استنباط بھی بیدار کرایا جائے۔ فراغت کے بعد آجکل اکثر طلبہ گھروں کو جاکر دوسرے مشاغل میں لگ جاتے ہیں۔ اہل مدارس ذہین طلبہ کو مطالعہ و تحقیق، تصنیف و افتاء اور معین مدرسین کی حیثیت سے کام میں لگا دیں یا درجات تخصص قائم کر کے انہیں مزید علمی ترقی کا موقع دیں اور طبعی رجحان و مناسبت کو دیکھ کر اسی کے مطابق تخصص میں مہارت حاصل کرنے کی ترغیب دیں۔

امام مالکؒ نے امام شافعیؒ کو فراغت کے بعد نصیحت فرمائی کہ علم کو ضائع نہ کریں بلکہ علم کی اشاعت اور درس و تدریس میں لگے رہیں۔ امام شافعیؒ مکہ معظمہ کے باشندے تھے۔ مگر طلبہ کا رجوع کم تھا۔ اس لئے پہلے بغداد تشریف لے گئے۔ جہاں علماء و طلباء کی کثرت تھی۔ بعد کو اشاعت علوم کے لئے مصر کا سفر اختیار کیا مگر آجکل ذہین طلبہ فراغت کے بعد ایسی جگہوں پر قیام کر لیتے ہیں۔ جہاں علم کے طلبگار نہیں ہوتے، علم کی اشاعت کا میدان نہیں ہوتا۔ تو حاصل کیا ہوا۔ ؟ استعداد بھی ضائع ہو جاتی ہے۔ بعض ذہین طلبہ حصول علم میں زندگی خرچ کر دیتے ہیں۔ اور ترقیٔ معاش ہی ان کا مقصدِ زندگی بن جاتا ہے۔ اور اس طرح اس مقصد کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ جس کے لئے عمر کا بہترین حصہ کھو چکا ہوتا ہے۔ بعض مدارس عربیہ نے تو فاضل اور مولوی فاضل ہی کو اپنا مقصد تعلیم بنالیا ہے۔ یہ رجحان بہرحال افسوسناک ہے۔ اچھے ذہین اور صلاحیتوں والے طلبہ کو ترغیب دینی چاہیئے۔ کہ وہ عالم باعمل بن کر قوم کی دینی خدمت کریں۔ اس راہ میں ابتداً جتنی معاشی تکالیف بھی آئیں گی، ان سے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ صبر و استقامت اور عزم و توکل کے بعد معاشی آسودگی کے اسباب بھی اللہ تعالیٰ پردۂ غیب سے فراہم کر دیتا ہے۔ منصبِ وراثت نبوت کو نگاہوں میں رکھ کر عزم و حوصلہ سے حالات کا مقابلہ کرتے رہیں۔ اور ایثار و قربانی سے کام لے کر علمی، تبلیغی اور دعوتی راستہ پر گامزن رہیں، یہ بھی ضروری ہے کہ موجودہ دور کے تقاضوں سے انہیں آگاہ کیا جاتا رہے، اور دینی و علمی فتنوں کے مقابلہ کے لئے طلبہ کو اچھی طرح تیار کیا جائے۔ جس طرح ہمارے اسلاف نے طلبہ کو اپنے زمانے کے علمی و فکری فتنوں کا انسداد کرنے کے لئے پوری طرح آگاہ کیا۔ اور پھر تصنیف و تعلیم کے ذریعہ ان فتنوں کا مقابلہ کیا۔

مدارس کو ہیئت اجتماعی سے ایسے محقق جیّد اور ماہر علماء کا بورڈ بھی بنانا چاہیئے، جو موجودہ فتنوں کا الاھم فالاھم تشخص کر کے ان فتنوں کے اصول اور بنیادی مباحث کو جمع کریں۔ اور پھر اس کا رد لکھوائیں۔ نیز طلبہ کو موجودہ زمانہ کے مسائل خواہ ان کا تعلق معاشیات و اقتصادیات سے ہو یا اعتقادیات یا معاشرتی و سماجی امور سے ہوں۔ پوری طرح آگاہ کرایا جائے، اور موجودہ غلط نظریات و تحریکات سے اسلام کا تقابلی مطالعہ و موازنہ بھی کرایا جاتا رہے، فلسفۂ قدیم کے ساتھ فلسفۂ جدید

سائنس و طبیعات اور علم الکلام سے بھی طلبہ کو واقف کرانا ضروری ہے۔ ان مسائل میں قدیم نظریات سے واقف طلباء جب نئے مسائل اور نظریات کا سامنا کرتے ہیں، تو تغیر پذیر اور ترقی پذیر طبیعاتی اور معاشی مسائل اور نظریات کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت سے عاری رہتے ہیں۔ نتیجۃً وہ خود بھی احساس کہتری میں مبتلا ہو کر دوسرے راستے اختیار کر لیتے ہیں اور معاشرہ پر بھی جدید نظریات سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے مؤثر تبلیغ کی شکل میں اثر انداز نہیں ہو سکتے۔

اکثر مدارس دینیہ کے طلبا کی عمریں غیر ضروری یا غیر لازمی علوم میں خرچ ہو جاتی ہیں۔ قرآن و حدیث اور دورۂ تفسیر میں ایک سال بھی پورا نہیں گزارتے حالانکہ اصل مقصد قرآن و حدیث ہے۔ اس پر سطحی عبور کافی نہیں۔ ایک ماہ میں قرآن مجید اور ۶ ماہ میں احادیث پر مرور فنی مناسبت پیدا کرنے کے لئے ناکافی ہے۔ علوم آلیہ و عقلیہ ضروری ہیں۔ مگر علوم مقصودہ اور علوم عقلیہ کی میعاد و مقدار میں توازن قائم کرنا بہرحال ضروری ہے۔

اب رہا طلبہ کے اخلاقی و عملی تربیت کا مسئلہ تو اس کی اہمیت بھی تعلیمی معیار قائم رکھنے سے کسی طرح کم نہیں۔ طلباء و اساتذہ کی اخلاقی اصلاح اور کردار کی تربیت کیطرف توجہ نہایت ضروری ہے۔ اس چیز کی کمی کی وجہ سے علم میں ترقی نہیں ہوتی ہے

فان العلم فضل من الله وفضل الله لا یعطی لعاص

مدارس میں اساتذہ ایسے ہونے چاہئیں جو اسلامی کردار کا بہترین نمونہ ہوں، اخلاقی کمالات سے بھرپور ہوں اور ظاہر و باطن میں شریعت و علوم شریعت کے فدائی ہوں۔ صوم و صلوٰۃ و اخلاق حسنہ سے متصف ہوں مطالعہ اور علمی ذوق تحقیق ان کا اوڑھنا بچھونا ہو وہ طلبہ کو مطالعہ، تکرار، درس و تدریس کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً ہدایات دیتے رہیں اور صحیح رخ پر اذہان کی تربیت کرتے رہیں۔ اگر اساتذہ کی قولی تربیت کے ساتھ ان کا اپنا عمل بھی اس کے مطابق ہو تو یہ چیز طلبہ پر لازماً اثر انداز ہوگی۔ ہمارے مدارس کے مردم خیز ہونے میں اساتذہ و منتظمین کے اخلاص و للہیت اور بلند کردار و با اخلاق ہونے کا بنیادی حصہ ہوگا اس سلسلہ میں ارباب مدارس اور اساتذہ کو طلبہ کے مشاغل عبادات، حاضری، اسباق، مطالعہ، بحث و مباحثہ اور مشاغل شب و روز پر بھی نگاہ رکھنا ضروری ہے۔ نیز طلبہ کو ذہنی لحاظ سے ان باتوں کی پوری تربیت دینی ضروری ہے۔ اور اس طرح کہ ہمیشہ یہ چیزیں مستحضر رہیں۔

(۱) راہ حق اور کلمۂ حق کی خاطر شدائد اور محن کے لئے تیاری کہ جتنا مقام اونچا ہے، اتنی ہی ابتلاء اور آزمائش بھی ہوگی۔

(۲) مقصد کی عظمت کا احساس کہ حصول تعلیم صرف اور صرف اشاعت دین، احقاق حق، اعلاء کلمۃ اللہ

اور مرضیات الٰہی کا حصول ہے۔ آگے سارے اثرات کا مدار اسی پر ہے۔ انما الاعمال بالنیات۔

(۳) حصولِ علم کی راہ میں فنائیت، تواضع، مسکنت اور انکساری کہ العلم عز یحصل بذل لا عز فیہ۔

(۴) سادگی، قناعت، زہد اور توکّل کی زندگی۔

(۵) اساتذہ، مدرسہ، رفقاء، منتظمین، علوم و فنون اور کتب سب کے ادب و احترام کا ہمہ وقت لحاظ ــــــ۔

(۶) جو کچھ سیکھا جائے اس پر پورا اذعان و یقین کہ گویا حاصل ہونے والی چیزیں قلب و روح اور رگ و ریشہ میں رچ بس جائیں اور اس پر عملی اثرات مرتب ہونے لگیں۔ یہ احساس نہ ہو کہ ہمارا کام علم سے ہے، عمل عوام کا کام ہے۔

یہ چند پراگندہ باتیں تھیں جو اس وقت ذہن میں آئیں۔ حق تعالیٰ آپ کی مساعی جمیلہ بار آور بنا دے اور پردۂ غیب سے اہل علم اور مدارس عربیہ کی اصلاح احوال کے اسباب ظاہر فرما دے۔ ■■

وما ذالک علی اللہ بعزیز

بقیہ: قربانی اور اسلام۔

کا تخم بویا تو کیکر اسیطرح مسلمان کے گھر پیدا ہوئے تو مسلمان ہوئے۔ حالانکہ اسلام نام عمل و اخلاق کا ہے۔ اس کا اپنا ایک معاشرہ ہے، الگ عقائد ہیں، وہ ایک خاص تہذیب دنیا میں پھیلاتا ہے جس کی بنیاد آخرت اور ایمان باللہ پر ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے قربانی سے ہمیں یہ درس دیا کہ اللہ کی راہ میں جان و مال، عزت و آبرو اور اولاد تک قربان کرنے کیلئے تیار رہیں۔ چنانچہ قربانی جان کے بدلے جان کا فدیہ ہے۔ قربانی کرتے ہوئے ہم صدق دل سے اپنے مولیٰ کے سامنے اقرار کرتے ہیں۔ کہ: ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین۔ میری نماز (عبادت) قربانی، زندگی اور موت (سب کچھ) اللہ کیلئے ہے جو پالنے والا ہے تمام مخلوقات کا ــــ قربانی کا سبق ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو ہم اپنا خون بھی راہ خدا اور اس کے دین کیلئے بہائیں ــــ۔ (اقتباس از وعظ عید گاہ۔ اکوڑہ۔ ذی الحجہ ۱۳۸۴ھ)

جناب اختر راھی۔ ایم اے
واہ کینٹ

محل وقوع و آبادی | موزنبیق مشرقی افریقہ میں تنزانیہ کے جنوب ، لاوی اور روڈیشیا کے مشرق میں واقع ہے۔ ملک کا کل رقبہ ۳۰۲۳۲۷ مربع میل اور آبادی اسّی لاکھ ہے۔ شمالی حصہ ملک میں مسلمانوں کی آبادی ۸۰ فیصد ہے اور بحیثیت مجموعی مسلمان کل آبادی کا ۵۰ فیصد ہیں۔ ۵ فیصدی عیسائی آبادی ہے۔ باقی بت پرست ہے۔

اسلام کی آمد | موزنبیق میں اسلام آٹھویں صدی عیسوی میں عرب تاجروں کے ذریعے پہنچا۔ اسلام کی سادہ تعلیمات نے عوام کے دلوں میں گھر کر لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مشرقی افریقہ کے ساحل پر ہلالی پرچم لہرانے لگا۔ عرب تاجروں کا بلند کردار اور پاکیزہ سیرت نے عوام کے دلوں میں ایک ایسا انقلاب برپا کر دیا تھا کہ بت پرست اپنے قبائلی عقائد اور بری رسموں کو چھوڑ کر اسلام کی سادہ تعلیمات کو اپنا رہے تھے۔

پرتگیزوں کی آمد | موزنبیق میں اسلامی تمدّن پھل پھول رہا تھا کہ یورپ میں صنعتی انقلاب آ گیا اور صنعتی انقلاب کے جلو میں استعمار پرستی رنگ دکھانے لگی۔ یورپ کی استعماری طاقتوں، اسپین، پرتگال، ہالینڈ اور فرانس وغیرہ نے تاریک برّاعظم (افریقہ) پر ہلّہ بول دیا۔ اور ہر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سولہویں صدی کے آغاز میں پرتگیزوں نے ساحل موزنبیق پر قدم رکھے۔ ۱۵۰۵ء میں "صوفالہ" پر قابض ہو گئے۔ اور مقامی آبادی کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔ پرتگیز قتل و غارت جبری مشقّت اور عیسائیت کی تبلیغ میں دوسری استعماری طاقتوں سے چند قدم آگے تھے، مقامی آبادی پر مظالم کی انتہا کر دی گئی۔ مگر مسلمانوں کا تابناک ماضی اس امر کا مستحق ہے کہ اسے سلام کیا جائے مسلمانوں

نے روزِ اوّل سے لیکر عہدِ حاضر تک مزاحمت کی اور تاحال یہ سلسلہ جاری ہے۔

شمالی موزنبیق کے مسلمانوں کی جہدِ مسلسل کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ پرتگیز اپنی تمام قوت کے باوجود بیسویں صدی کے آغاز تک چند ساحلی مقامات سے آگے نہ بڑھ سکے۔ بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں جدید ترین اسلحہ سے لیس پرتگیز سپاہی مسلمانوں کی مزاحمت کچلنے میں کامیاب ہو سکے۔

مسلمانوں کے خلاف سازشیں | موزنبیق پر مکمل قبضہ کے بعد حکمرانوں نے عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی نیز اسلام کی بیخ کنی کا پروگرام بنا لیا۔ اسلام ہی وہ طاقت ہے جو استعمار کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہو سکتی ہے۔ اسلام کو ایک متحرک قوت کی صورت میں بے اثر کرنے کے لئے چار نکاتی پروگرام طے پایا۔

۱- شمالی موزنبیق میں ابھرنے والی مسلمان قیادت کو قوت سے کچل دیا جائے۔

۲- اسلامی تعلیم اور خصوصاً عربی زبان کی تعلیم و ترویج پر پابندی لگا دی جائے۔

۳- تعلیم پر پرتگیز کیتھولک مشنریوں کا مکمل قبضہ ہو۔

۴- مسلمانانِ موزنبیق کو باقی دنیائے اسلام سے کاٹ دیا جائے اور ان کے مسائل کو ابھرنے ہی نہ دیا جائے۔ متذکرۃ الصدر چار نکاتی پروگرام پر حکمران سختی سے عمل پیرا ہیں۔ مسلمان قیادت کو فوج اور پولیس کی طاقت سے کچل دیا جاتا ہے۔ جوں ہی کوئی مسلمان راہنما عوام کی توجہ حکمرانوں کے تباہ طرزِ عمل کیطرف مبذول کراتا ہے، اُسے چپکے سے ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے۔ ماضی میں بعض نمایاں افراد کو ساؤتھوم (SAO THOME) کے بیگار کیمپوں میں بھیج دیا جہاں "کوکا" کے درخت لگاتے لگاتے راہئ ملکِ عدم ہو گئے۔ بعض پولیس کی گولی کا نشانہ بن گئے یا پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیئے گئے۔ ظلم کی انتہا یہ ہے۔ کہ بعض راہنماؤں کو ہوائی جہاز کے ذریعے ان کے دیہاتوں پر گرایا گیا۔ تاکہ آزادی پسندوں کو کان ہو جائیں مگر آزادی کی تڑپ میں کوئی کمی آنے کی بجائے شدّت ہی پیدا ہوئی۔ سچ ہے۔ ع

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

مسلمانوں کو ذہنی طور پر افلاس زدہ کرنے کی خاطر شمالی موزنبیق میں مسلمانوں کے مدارس بند کر دیئے گئے، عربی زبان پر مکمل پابندی لگا دی گئی، اور اس طرح قرآنِ کریم کی تعلیم کو ناممکن بنا دیا گیا۔ ظاہر ہے جو نئی نسل پروان چڑھ رہی ہے۔ وہ اپنے مرکز و محور یعنی قرآن ہی سے دور ہو گی۔ اور اس میں پرتگیز حکمرانوں کو اپنا مستقبل روشن دکھائی دیتا ہے۔ اور عیسائیت کی تبلیغ کارگر محسوس ہوتی ہے۔ ۱۹۴۰ء میں ویٹیکین اور پرتگیز حکمرانوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا جسکی رُو سے افریقیوں کی تعلیم کی اجارہ داری

پرتگیز کیتھولک چرچ کو مل گئی۔ اب مسلمان اپنے طور پر تعلیمی ادارے قائم نہیں کر سکتے اور اپنے بچوں کو اسلامی تہذیب و تمدن اور نظریۂ حیات کے مطابق تعلیم دینے سے قاصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ۵۰ فیصد مسلمانوں کی نسبت صرف ۵ فیصد عیسائی اقلیت میں تعلیم یافتہ افراد زیادہ ہیں۔

MANO کا قیام | مسلمان فوجی شکست کے باوجود معاشی استحصال، مذہبی قید و بند اور سماجی تشدد سے نجات حاصل کرنے کیلئے کوشاں ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں مسلمانوں اور شمالی موزنبیق کے قوم پرست گروہوں نے مل کر "موزنبیق افریقین نیشنل یونین" (MANO) کی تشکیل کی اس تنظیم نے کبریتی دیوانی (KIBRITI DIWANI) کے زیر سرکردگی جبری بیگار اور ناقابل برداشت ٹیکسوں کے بوجھ کے خلاف مظاہروں اور ہڑتالوں کا پروگرام بنایا۔ موزنبیق میں سالانہ تقریباً چار لاکھ افراد کو جبری مشقت جھیلنا پڑتی ہیں۔ جنوبی موزنبیق میں کام کے اہل صرف ۵ فیصد آبادی دیہات میں رہ جاتی ہے۔ باقی آبادی قصبوں اور شہروں میں ملازمت اختیار کر لیتی ہے یا مقامی و غیر ملکی ایجنٹوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ ۱۹۶۰ء کے آغاز میں موزنبیق کی تین لاکھ آبادی جمہوریہ جنوبی افریقہ اور روڈیشیا میں کام کرتی تھی۔

MANO کی تحریک کو پرتگیز حکومت نے تشدد، خوف و ہراس اور جبر و تشدد سے روکا۔ صرف "میوڈا" میں پانچ سو مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا۔ زخمیوں کی تعداد کا اندازہ ناممکن ہے۔ MANO کے کئی نمایاں لیڈروں کو پرتگیز گورنر نے بحث و تمحیص کے لئے بلایا اور انہیں دھوکے سے گرفتار کر لیا۔ ان گرفتار ہونے والوں میں تنظیم کے صدر کبریتی دیوانی بھی شامل تھے جو تاحال زنداں میں پڑے ہوئے ہیں۔ پرتگیزوں کے جبر و تشدد اور ظلم و ستم سے مجبور ہو کر تین ہزار سے زائد افراد ملادی تنزانیہ اور کینیا میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اور ان ملکوں میں مہاجروں کی زندگی گزار رہے ہیں۔

مسلح انقلاب | ۱۹۶۰ء میں انجمن کو سخت مراحل سے گزرنا پڑا۔ حکمرانوں کے تشدد نے مقامی آبادی کو مجبور کر دیا کہ وہ غصب شدہ حقوق کی بحالی اور آزادی کے حصول کے لئے مسلح انقلاب کی راہ اختیار کرے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن الیسانی کی قیادت میں ۲۸؍ اگست ۱۹۶۴ء کو مسلح انقلاب کا آغاز کر دیا گیا۔

مسلمانوں کے خلاف ایک اور سازش | پرتگیزوں نے مسلح جدوجہد کے بعد سمجھ لیا کہ انہیں جلد یا بدیر موزنبیق سے بوریا بستر سمیٹنا پڑے گا۔ وہ اس کوشش میں رہے کہ ایک ایسے گروہ کو آزادی کا طلبگار بنا دیا جائے جو ان کے چلے جانے کے بعد عیسائیت کا تحفظ کر سکے۔ چنانچہ وہ ایسا گروہ سامنے لانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ لوگ "جذب شدہ افریقی" کہلاتے ہیں۔ انہوں نے

عیسائی مشنریوں سے تعلیم پائی ہے۔ اور اعلیٰ تعلیم یورپی ملکوں میں حاصل کی ہے۔ موزنبیق میں یہ غیر مسلم عنصر مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس عیسائی اقلیت نے "موزنبیق محاذ آزادی" (FRELIMO) قائم کر رکھا ہے۔ جسے امریکہ اور اسرائیل کے زیرِ اثر افریقی ملکوں کی بھرپور تائید حاصل ہے۔ محاذِ آزادی کے پہلے صدر مانڈلین (EDUARDE MONDLANCE) نے ایک امریکی نژاد خاتون سے شادی کر رکھی تھی۔

محاذِ آزادی کا مرکزی دفتر "دارالسلام" میں ہے اور اسے تنزانیہ کے مطابق سربراہ نائرے کی پوری تائید حاصل تھی۔ محاذِ آزادی عوام میں قطعاً مقبول نہیں۔ موزنبیق کے عوام حقیقی آزادی چاہتے ہیں۔ وہ آقا بدلنے کے حق میں نہیں ہیں۔

محاذِ آزادی نے ۱۹۶۷ء میں مسلح جدوجہد شروع کی۔ اس پر پہلی ضرب ۱۹۶۹ء میں اس وقت پڑی جب اس کا راہنما ایڈورڈ مونڈلین دارالسلام میں بم پھٹنے سے ہلاک ہوگیا۔ محاذِ آزادی نے خاصے بڑے رقبے پر قبضہ جما رکھا ہے۔ اور اس نے شمالی صوبے میں قدم جمائے ہیں۔ حالات سے یہ اندازہ ہوتا ہے۔ کہ جس طرح کئی دوسرے افریقی ملکوں جیسے ایتھوپیا، سینیگال، سیرے الیون، ایوری کوسٹ چاڈ اور تنزانیہ میں مسلمان اکثریت کے باوجود مختصر سی عیسائی اقلیت حکمران ہے۔ اسی طرح موزنبیق میں عیسائی اقلیت اپنے وسائل کے بل بوتے پر مسلمانوں کو زک پہنچا رہی ہے۔

عالمِ اسلام سے توقعات | پرتگال کے لئے موزنبیق پر زیادہ عرصہ تسلّط قائم رکھنا ناممکن ہے۔ نوآبادیوں کی تحریکِ آزادی کی وجہ سے پرتگال کی معیشت تباہ ہو چکی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں کل بجٹ کا ۴۲ فیصد رقم افریقی ممالک میں فوج پر خرچ ہوئی۔ ۱۹۶۰ء کی نسبت فوجی اخراجات دوگنے ہو گئے ہیں۔ اگرچہ پرتگال کو اسلحہ کی کمی نہیں تاہم پرتگال کے قدم اکھڑے ہوئے ہیں۔

مسلمانانِ موزنبیق عالمِ اسلام سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ مسلمان نوجوانوں کو اپنے ملکوں میں اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں مہیا کریں تاکہ جذب شدہ افریقیوں کے مقابلے میں تعلیم یافتہ قیادت مہیا کی جا سکے اور آزاد ہونے والے موزنبیق کو اسلامی روایات اور رجحانات کے مطابق ڈھالا جا سکے۔ ■■

مرزا ظفر اللہ کے ابتدائی دور کی سازشوں کا شاخسانہ

کشمیر میں قادیانی سازشیں

زاہد شاہین ۔ ایم ۔ اے

کشمیر میں قادیانی سازشوں کی تفصیل بڑی طویل اور خونچکاں ہے۔ قادیانیوں نے کشمیر کی مخصوص جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے اس پر ہمیشہ نظر رکھی۔ قادیانیوں کے پہلے خلیفہ حکیم نورالدین بھیروی ڈوگرہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں ۱۸۷۶ء میں شاہی طبیب مقرر ہوئے۔ انگریز کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ ڈوگرہ مہاراجہ رنبیر سنگھ روس سے سازباز کر کے ان کے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہ کر دے۔ رنبیر سنگھ نے چار آدمیوں پر مشتمل ایک وفد روس بھیجا[۱] تاکہ روسی تعاون سے انگریزوں کی بالادستی سے نجات حاصل کی جائے۔ رنبیر سنگھ کی وفات کے بعد پرتاب سنگھ نے گدی سنبھالی۔ اس کا رجحان بھی روس کی طرف تھا[۲] انگریزوں نے مہاراجہ کشمیر کی کارروائیوں پر نظر رکھنے کے لئے حکیم نورالدین کی خدمات حاصل کیں۔ حکیم صاحب بڑی کامیابی سے جاسوسی کے فرائض انجام دیتے رہے۔[۳] آپ نے پرتاپ سنگھ کے بھائیوں رام سنگھ اور امر سنگھ سے خصوصی تعلقات قائم کرئیے اور ان کی مدد سے محلاتی سازشوں کی پشت پناہی کی۔ آخر کار انگریز نے پرتاپ سنگھ کو اقتدار سے معزول کر کے اس کی جگہ ایک کونسل قائم کر دی۔ چند سال بعد جب انگریز کو مہاراجہ کی وفاداری کا یقین ہو گیا۔ تو اسے دوبارہ اقتدار سونپ دیا گیا۔ مہاراجہ نے اقتدار پر قابض ہونے کے بعد ۱۸۹۲ء میں حکیم نورالدین کو چوبیس گھنٹے کے اندر ریاست چھوڑ دینے کا حکم دیا۔[۴] اس طرح اس نے ایک سامراجی آلہ کار سے نجات پائی۔ قادیانی مصنف عبدالقادر کی کتاب حیات نورالدین، اور اکبر شاہ نجیب آبادی کی مرتب کردہ

---

[۱] دوندرا کوشک، سنٹرل ایشیا ان ماڈرن ٹائمز، ماسکو ۱۹۷۰ء صفحہ ۱۰۴

[۲] جوزف کوربل، ڈینجر ان کشمیر، نیویارک صفحہ ۱۴

[۳] ممتاز احمد، مسئلہ کشمیر، صفحہ ۵۵

[۴] تاریخ احمدیت جلد ششم مولفہ دوست محمد قادیانی

نورالدین کی سوانح مرقاۃ الیقین، سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکیم نورالدین کا مہاراجہ پر بڑا اثر تھا۔ اور وہ سیاست میں کافی دخیل تھے۔ قادیانیوں نے نورالدین کے اخراج پر پردہ ڈالنے کے لئے دو تاویلیں گھڑی ہیں۔ اوّل یہ کہ آپ کو گاؤکشی کے الزام میں نکالا گیا تھا۔ دوسرے آپ رام سنگھ اور امر سنگھ کو مسلمان کرنا چاہتے تھے۔ یہ لغو تاویلات دوست محمد قادیانی کی مرتبہ تاریخ احمدیت جلد ششتم میں مذکور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نورالدین سامراج کے پٹھو، انگریز کے جاسوس اور برطانیہ کے ازلی حاشیہ بردار تھے اور انہیں سیاسی جرائم کی وجہ سے ریاست بدر کیا گیا۔[1]

نورالدین ریاست بدر ہونے کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی کے پاس قادیان چلے آئے۔

۱۹۰۸ء میں مرزا قادیانی کے مرنے کے بعد پہلے خلیفہ بنے اور ۱۹۱۴ء میں آپ کے انتقال کے بعد مرزا بشیرالدین محمود نے قادیان کی گدی پر قبضہ کیا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہندوستان اور روس کے سیاسی حالات پر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ۱۹۱۷ء میں زار کی حکومت دم توڑ چکی تھی، اور روس میں اشتراکیوں نے اقتدار سنبھال لیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں انگریزوں نے افغانستان کو اپنی جارحیت کا نشانہ بنایا۔ افغان جنگ کے بعد روسی توسیع پسندی کا خطرہ زیادہ شدت سے محسوس کیا جانے لگا۔ ادھر ہندوستان میں سیاسی حالات مخصوص صورت اختیار کر چکے تھے۔ پہلی جنگ عظیم نے ہندوستان میں سیاسی بیداری کی لہر دوڑا دی۔ تحریک ریشمی رومال نے برطانوی سامراج کے استبدادی نظام پر ضرب کاری لگائی۔ برطانوی سامراج کے خلاف لندن، پیرس، ٹوکیو، برلن، سٹاک ہوم، نیویارک، سان فرانسسکو اور کیلیفورنیا میں انقلابی جماعتیں قائم ہوئیں۔ کابل میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے دیگر انقلابیوں راجہ مہندر پرتاپ، پروفیسر برکت اللہ وغیرہ کی مدد سے عارضی حکومت قائم کی۔ اشتراکی روس نے ہندوستان کے انقلابیوں کو منظم کرنے کے لئے تاشقند بخارا، اور سمرقند میں بڑے بڑے تربیتی مراکز قائم کر دیئے۔ ان مراکز سے ہندوستان کے سرحدی علاقوں سنکیانگ، افغانستان، کشمیر وغیرہ میں سیاسی کارروائیاں کی جائیں۔ کشمیر کے سرحدی علاقے گوریلا کارروائیوں کے لئے بہت اہم تھے۔ روسی سفیر ریزکولیکوف انقلابی جماعتوں کی رہنمائی کرتا تھا۔ یاد رہے وسط ایشیاء میں تربیت پانے والے انقلابیوں جیسے مہندر پرتاپ ——— پروفیسر برکت اللہ ایم۔ این اواے۔ محمد علی، بی۔ ایم اچاریہ میں سے بعض لوگوں نے بعد میں ہندوستان میں کمیونسٹ تحریک کی داغ بیل ڈالی۔ برطانیہ کے محکمہ خارجہ نے روس کو یہ کارروائیاں بند کرنے کا مشورہ دیا اور معاہدات کی تنسیخ کی دھمکی کے علاوہ الٹی میٹم بھی دے دیا مگر

---

[1] رفیق دلاوری، رئیس قادیان۔ جلد دوم۔

روس ان انقلابیوں کی سرپرستی کرتا رہا۔ اور لینن بار بار آزاد ایشیا زندہ باد کے نعرے لگاتا رہا۔[1]

۱۹۲۱ء میں قادیانی خلیفہ مرزا محمود نے برطانوی آقاؤں کے اشارے پر ایک دورخی پالیسی وضع کی۔ آپ نے روس میں مبلغوں کے روپ میں اپنے جاسوس بھیجنے شروع کر دیئے۔ اور کشمیر میں تبلیغ کے نام پر اڈے قائم کر دیئے۔ برگلز اللہ پہلے قادیانی تھے، جنہوں نے زار کے زمانے میں روس کے مذہبی اور سیاسی حالات کا مطالعہ کیا۔ آپ جولائی ۱۹۱۳ء میں روس گئے۔ ۱۹۱۴ء میں جب آپ انگلستان میں طالب علم تھے، آپ نے روس جانے کا پروگرام بنایا تاکہ وہاں کے اونچے طبقے سے رابطہ قائم کر سکیں۔ لیکن جنگ عظیم اوّل کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔[2] ۱۹۲۱ء میں محمد امین قادیانی کو وسط ایشیاء میں جاسوسی کے لئے بھیجا گیا۔ قادیانی مبلغ فتح محمد سیال لکھتا ہے:

"۱۹۲۱ء میں ہم نے اپنے دوست مولوی محمد امین خان صاحب کو بطور مبلغ بھیجا۔ چونکہ حکومت برطانیہ اور روس کے تعلقات جنگ کے بعد خراب چلے آ رہے تھے۔ اس لئے پاسپورٹ نہ مل سکا۔ مولوی صاحب نے ایران تک پیدل سفر کیا۔ اور ایران کے راستے روس میں داخل ہوئے، روسی حکومت کے آدمیوں نے ان کو گرفتار کر لیا اور انگریزی جاسوس سمجھ کر جیل خانہ میں ڈال دیا مولوی صاحب موصوف دو سال مختلف جیل خانوں میں رہے اور ان کی سختیوں کو برداشت کرتے رہے...... دو سال بعد وہ واپس مرکز تشریف لائے، لیکن تھوڑے عرصے کے بعد ہمارے امام (مرزا محمود) نے پھر دوبارہ ان کو بھیجا اور اب کی دفعہ ان کے ساتھ ایک اور نوجوان ظہور حسین صاحب مولوی فاضل کو بھی بھیجا یہ دونوں صاحب پھر ایران کے راستے روس میں داخل ہوئے"۔[3]

"چونکہ برادرم محمد امین صاحب کے پاس پاسپورٹ نہ تھا۔ اس لئے وہ روس میں داخل ہوتے ہی روس کے پہلے ریلوے اسٹیشن قصبہ پر انگریزی جاسوس قرار دیئے جا کر گرفتار کئے گئے"۔[4] رہائی کے بعد مولوی محمد امین اور ظہور حسین نے وسط ایشیاء کے انقلابی مراکز

---

[1] جوزف کوربل، ڈینجر ان کشمیر [2] اصحاب احمد جلد ۱۱ مؤلفہ صلاح الدین قادیانی ربوہ۔

[3] جماعت احمدیہ کی اسلامی خدمات، فتح محمد سیال قادیانی، اسلامیہ سٹیم پریس لاہور ۱۹۲۷ء صفحہ ۳۰۔

[4] الفضل قادیان، مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۲۳ء

کا جائزہ لیا۔ برطانوی آقاؤں کے لئے خفیہ معلومات حاصل کیں اور انقلاب دشمن مواد انگریزوں کو روانہ کیا۔ آخر کار ظہور حسین پکڑا گیا۔ اور روسی پولیس نے اس سے سازشی مواد برآمد کر لیا۔ اور اسے جاسوسی کے جرم میں قید کر دیا۔ مرزا محمود نے انگریزوں کی مدد سے اسے رہا کرایا اور برطانوی وائسرائے کو پیش کئے جانے والے ایک ایڈریس میں انگریزوں کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی کوششوں سے قادیانی مبلغ کو رہائی نصیب ہوئی۔"[1]

ایک طرف تو قادیانی جاسوس وسط ایشیاء میں سرگرم تھے، تو دوسری طرف مرزا محمود کشمیر میں سازشوں کے جال پھیلا رہے تھے۔ جون ۱۹۲۱ء میں آپ نے کشمیر کا سفر اختیار کیا اور وہاں کے حالات کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ آپ اپنے ایک خطبے میں فرماتے ہیں:

"احمدیوں کے پاس ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی نہیں جہاں احمدی ہی احمدی ہوں کم از کم ایک علاقہ کو مرکز بنالو اور جب تک ایک ایسا مرکز نہ ہو جس میں کوئی غیر نہ ہو اس وقت تک تم مطلب کے مطابق امور جاری نہیں کر سکتے اور نہ اخلاق کی تعلیم ہو سکتی ہے اور نہ پورے طور پر تربیت کی جا سکتی ہے۔ اس لئے نبی کریمؐ نے حکم دیا تھا کہ حجاز سے مشرکوں کو نکال دو۔ ایسا علاقہ اس وقت تک ہمیں نصیب نہیں جو خواہ چھوٹے سے چھوٹا ہو، مگر اس میں غیر نہ ہوں، جب تک یہ نہ ہو اس وقت تک ہمارا کام بہت مشکل ہے اگر یہ نہ ہوا تو کام اور مشکل ہو جائے گا۔"[2]

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ مرزا محمود کشمیر کو قادیانی سٹیٹ بنانے کے لئے ایک طویل عرصے سے برطانوی سامراج کے ساتھ ساز باز کر رہے تھے۔ اور اس سلسلے میں مسلسل سازشیں کی جا رہی تھیں۔ ۱۵ جون ۱۹۲۹ء کو مرزا محمود نے تیسری دفعہ کشمیر کا دورہ کیا۔ اور قادیانی سٹیٹ کے قیام کے منصوبے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ ۱۹۳۰ء میں آپ نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا:

"اگر تم بھی اللہ کے پیارے ہو تو اس وقت تک کہ تمہاری بادشاہت نہ قائم ہو جائے تمہارے راستہ میں یہ کانٹے ہرگز دور نہیں ہو سکتے۔ اور تمہیں کبھی بھی امن و امان حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر آج کسی وجہ سے سکھ ہے تو کل یقیناً پھر دکھ کی حالت ہو جائے گی۔"[3]

---

[1] تحفہ شہزادہ ویلز، مرزا بشیر الدین محمود۔ [2] الفضل قادیان مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۲۲ء
[3] الفضل قادیان مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۳۰ء

۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو نواب مالیر کوٹلہ محمد علی قادیانی کی کوٹھی بمقام شملہ ایک اجلاس ہوا جس میں خواجہ حسن نظامی، سرفضل حسین، ڈاکٹر محمد اقبال، مولانا اسمٰعیل غزنوی، مولانا میرک شاہ، اے آر ساغر وغیرہ نے شرکت کی[۱]۔ اس اجلاس میں طے پایا کہ ایک آل انڈیا کشمیر کمیٹی قائم کی جائے تاکہ ریاست کے مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ہو ان کو سیاسی امداد مہیا کی جائے۔ مرزا محمود کو کمیٹی کا ڈکٹیٹر مقرر کر دیا گیا۔ لیکن انہوں نے صدر بننا قبول کیا۔ کمیٹی کے آئندہ طریقِ کار کے لئے کوئی باقاعدہ دستور کی تدوین نہ کی گئی۔

مسلم زعماء جانتے تھے کہ قادیانی سامراج کے ایجنٹ ہیں۔ اور مرزا محمود والسرائے کے چہیتے ہیں، ان کے انگریز افسروں سے گہرے مراسم ہیں ان کی ایک جماعت ہے۔ اور ان کے پاس مالی ذرائع ہیں۔ اگر ان کے ذریعے کشمیری مسلمانوں کے کچھ مسائل حل ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ انہوں نے تمام اختلافات نظرانداز کر کے مرزا محمود کو صدارت سونپ دی۔ لیکن قادیانی خلیفہ اور ان کے حواری کشمیر کمیٹی کی آڑ میں برطانوی آقاؤں کی سیاسی پالیسی کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے۔ اور کشمیر کو قادیانی ریاست بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

کمیٹی کا صدر بننے کے بعد مرزا محمود نے کشمیر کے طول و عرض میں تبلیغی مراکز کا جال بچھا دیا۔ قادیان سے لاتعداد ٹریکٹ اور پمفلٹ وادی میں پھیلا دیئے گئے۔ قادیان میں ایک پبلسٹی کمیٹی مقرر کی گئی اور نظامت امور خارجیہ کے تحت ایک باقاعدہ محکمہ قائم کر دیا۔ تاکہ اندرونی نظم و نسق قائم کیا جا سکے[۲]۔ کشمیر میں ابھرتی قیادت کو ساتھ ملانے کے لئے ریاستی تحریکوں میں قادیانیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں مسلمانوں کو محسوس ہو گیا کہ قادیانی کشمیر میں ارتداد کے کانٹے بو رہے ہیں۔ اور سامراج کے اشارے پر سرگرم عمل ہیں۔ وگرنہ ان کے نزدیک دنیا کے تمام مسلمان جو مرزا قادیانی کو نبی نہیں مانتے وہ مطلق کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ کشمیری مسلمانوں سے ہمدردی کا انہوں نے محض سوانگ بھرا ہوا ہے۔ ان کافروں کی مدد کے پس منظر میں کوئی سازش کارفرما ہے۔

یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ ایک طرف قادیانی ہندوستان کی حریت پسندانہ تحریکوں کو کچلنے میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن دوسری طرف کشمیر میں آزادی کے علمبردار بنے بیٹھے تھے۔ قادیانیوں کی منافقت اسی سے بھی عیاں تھی کہ ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں بھی مسلمانوں کے ساتھ ظلم ہو رہا تھا۔ لیکن قادیانی صرف کشمیر پر ہی اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے تھے۔ قادیانی سازشوں کو مجلس احرار نے بے نقاب کیا۔ چوہدری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر، حبیب الرحمٰن لدھیانوی، ماسٹر تاج الدین جیسے احراری اکابر نے مسلمانوں کو اس فتنہ سے آگاہ کیا۔ اور

---

[۱] کشمیر کی کہانی، مؤلفہ ظہور احمد قادیانی۔ [۲] تاریخ احمدیت جلد ششم

کشمیری مسلمانوں کی حمایت میں ایک زبردست تحریک چلائی۔
احرار رہنماؤں نے اکتوبر ۱۹۳۱ء میں مہاراجہ کشمیر سے مفاہمت اور مصالحت کرنے کی کوشش کی۔[۱] کشمیریوں کو حقوق دلانے کے لئے اپنے کئی سیاسی رہنما قید کرائے جب مہاراجہ کشمیر کسی طرح نہ مانا تو احرار عوامی تحریک چلانے پر مجبور ہو گئے، ماسٹر تاج الدین مرحوم لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ ریاست کے سربراہ برطانوی نشے میں بدمست تھے وہ احرار کو خاطر میں نہیں لا رہے تھے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ دیوانے بھڑک اٹھے تو ریاست کا انجر پنجر ڈھیلا کر کے رکھ دیں گے۔ جب مصالحت کی تمام راہیں بند ہو گئیں تو احرار نے یلغار کا بگل بجا دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ احرار کے بہادر اور جانباز رضاکار بگولے کی طرح اٹھے اور ریاست کشمیر پر آندھی کی طرح چھا گئے"[۲]

مجلس احرار کی عظیم اور ولولہ انگیز تحریک کو برصغیر کی آزادی کی تحریکوں میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس تحریک نے ڈوگرہ شاہی کے ایوانوں میں زلزلہ بپا کر دیا۔ اور قادیانیت کے مذموم عزائم کو آشکار کر دیا۔

حضرت علامہ انور شاہ کاشمیریؒ نے علامہ اقبال سے ملاقات کی اور انہیں اپنا رسالہ پڑھ کر سنایا جس میں ختم نبوت کی بنیادی اہمیت کو واضح کیا گیا تھا۔[۳] مسلم زعماء نے مرزا محمود کو ایک مکتوب روانہ کیا اور مطالبہ کیا کہ پندرہ دن کے اندر اندر کمیٹی کا اجلاس بلایا جائے۔ تاکہ عہدیداروں کا انتخاب عمل میں لایا جائے اس کے علاوہ ۴ر مئی ۱۹۳۳ء کو سول اینڈ ملٹری گزٹ میں یہ بیان شائع کرایا گیا کہ کمیٹی کا آئندہ صدر قادیانی نہیں ہوا کرے گا۔ ۷ر مئی ۱۹۳۳ء کو سیسل ہوٹل لاہور میں کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ جس میں مرزا محمود نے استعفیٰ پیش کر دیا۔ آپ بھانپ چکے تھے کہ اب یہاں کی دال نہیں گلے گی۔ کیونکہ تمام سازش بے نقاب ہو چکی تھی۔ کشمیر کمیٹی کے نئے صدر علامہ اقبال مقرر ہوئے۔ قادیانیوں نے فوراً ہی کمیٹی کے کام انجام دینے بند کر دیئے اور علامہ موصوف کی صدارت کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گئے۔ آخر کار علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۳ء میں کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔۔۔۔

کشمیر میں قادیانیوں کی شرمناک کارروائیاں اور انگریز کی پشت پناہی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شیخ الہند

۱۔ تاریخ احرار، چوہدری افضل حق، مرکزی مجلس احرار اسلام، ملتان ص ۳۸

۲۔ تحریک کشمیر اور احرار، ماسٹر تاج الدین، ص ۶

۳۔ رئیس الاحرار، مؤلفہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی۔ ص ۹۹

مولانا محمود الحسنؒ اور مولانا عبید اللہ سندھی وسط ایشیا کو بیس بنا کر مشرقِ وسطیٰ میں سامراج کے خلاف تحریک چلا چکے تھے۔ یہ تحریک اندر ہی اندر پھیلتی چلی جا رہی تھی۔

"انگریزوں کا منشا یہ تھا کہ وہ خشکی کے راستے سے ترکی کے ساحل تک، ایک مسلسل علاقہ اپنے قبضہ میں کر لیں تاکہ اس طرح بحری و بری دونوں راستوں سے مشرقِ وسطیٰ اور ایشیا، کا مسلم علاقہ ان کے تسلط میں گھرا رہے۔ لیکن جب ہندوستان کی بڑھتی ہوئی تحریک آزادی اور ہندو مسلم اتحاد کے نئے دور نے کشمیر پر ہندو راجہ کے تسلط کی افادیت کو مشکوک بنا دیا۔ تو اب انگریز کو اس امر کی ضرورت ہوئی کہ کوئی اور زیادہ قابلِ اعتماد واسطہ تلاش کیا جائے اور اس اعتبار سے قادیانی فرقہ نہایت سودمند نظر آیا۔ ایک تو وہ انہیں کا تیار کردہ تھا۔ اور امتِ مسلمہ سے باغیانہ طور پر علیحدہ ہو چکا تھا۔ مگر اسلام کا ظاہری لیبل اس پہ اب بھی چسپاں تھا۔ اور چونکہ اس فرقہ کے مفادات عالمگیر مسلم مفادات کے قطعی برعکس و مخالف تھے۔ اس لئے وہ آخری مرحلہ تک انگریزوں کے لئے قابلِ اعتماد ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر ہندو مسلم اتحاد برقرار بھی رہے اور پورے ہندوستان کو سیاسی حقوق دینا بھی پڑ جائیں تو بھی کشمیر میں مرزائیوں کے اثر و غلبہ کی موجودگی سے کم از کم یہ علاقہ باقی ہندوستان سے علیحدہ رکھ کر بھی برطانوی مفادات کے لئے استعمال کیا جا سکتا تھا۔"[1]

۱۹۳۴ء میں قادیانی نقطہ نظر کی وضاحت کرنے کے لئے سری نگر سے ایک اخبار الاصلاح نکالا گیا۔ اسی سال انگریزوں نے مہاراجہ کشمیر سے گلگت کا علاقہ ۶۰ سال کے لئے پٹے پر لے لیا، تاکہ روسی توسیع پسندی کا مقابلہ کیا جا سکے۔[2]

اس کے بعد قادیانیوں نے اپنی تحریک کا رخ بدل لیا۔ کشمیر کے طول و عرض میں قائم کئے گئے، مراکز کو قادیانی مبلّغوں نے اپنے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لئے سیاسی اڈوں کے طور پر استعمال کیا۔ عبدالرحیم درد زین العابدین ولی اللہ شاہ، ظہور احمد، خلیفہ نور دین، خواجہ عبدالغفار ڈار، غلام نبی گلکار اور ایسے بیسیوں قادیانی مسلمانوں کے مفادات کو سبوتاژ کرنے میں مصروف تھے۔ متنبی قادیان کی لاہوری ذریت نے

---

[1] ترجمان اسلام لاہور، مورخہ ۸ر مارچ ۱۹۶۸ء

[2] الیسٹیر لیمب، کرائسس ان کشمیر۔

ایک پرچہ روشنی نکلا جس کے مدیر عزیز کاشمیری تھے ۔ اس میں لاہوری مرزائیوں کے نقطۂ نظر کو واضح کیا جاتا تھا ۔ پنجاب میں احرار کا آرگن مجاہد، زمیندار اور مولانا میکش کے اخبار احسان نے قادیانیوں کی دسیسہ کاریوں سے کشمیری مسلمانوں کو آگاہ کیا۔

قادیانیوں نے مسلمانوں کی واحد سیاسی جماعت آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے خلاف ریشہ دوانیاں کیں، یہ سیاسی تنظیم گلانس کمیشن کی سفارشات کے نتیجہ میں ۱۹۳۲ء میں قائم ہوئی تھی۔ آخر کار کانفرنس کے ایک تاریخی اجلاس میں شیخ محمد عبداللہ، اور چوہدری غلام عباس کی موجودگی میں قادیانیوں کو مسلم کانفرنس سے خارج کر دیا گیا۔ میر واعظ کشمیر مولانا محمد یوسف شاہ مرحوم نے قادیانی فتنہ کی سرکوبی میں نمایاں حصہ لیا۔

۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس دو حصوں میں بٹ گئی ۔ قادیانیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے مسلمانوں کے باہمی اختلافات کو خوب ہوا دی ۔ سیاسی کشیدگی کی فضا پیدا کی گئی ۔ اور انتشار و افتراق کے کانٹے بوئے گئے ۔ شیخ عبداللہ کی نیشنل کانفرنس نے پہلے تو اشتراکیوں سے گٹھ جوڑ کر کے نیا کشمیر کا نعرہ لگایا بعد میں ۱۹۴۶ء میں کشمیر چھوڑ دو تحریک چلائی[1]

مرزا محمود نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے مہاراجہ کشمیر کی حمایت کا اعلان کیا۔ اور الاصلاح سری نگر میں مہاراجہ کے حق میں مواد شائع ہونے لگا[2] یہ وہ زمانہ تھا جب کانگری لیڈر کشمیر میں دورے کر کے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کر رہے تھے ۔ ۴ر جولائی ۱۹۴۶ء کو مرزا محمود نے اپنے ایک مضمون میں مہاراجہ کشمیر سے ہمدردی کا اظہار کیا[3] اس ہمدردی کے پس پردہ ایک سازش کارفرما تھی ۔ مرزا محمود کشمیری مسلمانوں کی تحریک آزادی کو نظر انداز کر کے ڈوگرہ شاہی کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنا چاہیے تھا۔ تاکہ مستقبل میں اس علاقہ میں قدم جمائے جا سکیں۔

۱۹ر جولائی ۱۹۴۷ء کو مسلم کانفرنس نے الحاق پاکستان کی قرارداد پاس کر دی ۔ اگلے ماہ ملک تقسیم ہو گیا اس نوزائیدہ مملکت کو سب سے پہلے ایک قادیانی سر ظفر اللہ نے نقصان پہنچایا ۔ بونڈری کمیشن میں قادیانی سازش سے گورداسپور کا علاقہ پاکستان کے حصے میں نہ آسکا ۔ اور اس طرح بھارت کو پٹھانکوٹ سے کشمیر پہنچنے کا راستہ مل گیا ۔ مرزا محمود نے رتن باغ لاہور میں ڈیرے ڈالنے کے بعد فوری طور پر کشمیر میں دلچسپی لینا شروع کر دی ۔ اس وقت کشمیر میں آزادی کی تحریک شروع تھی ۔ مرزا محمود کے خاص پروگرام کے مطابق

---

[1] جوزف کوربل ۔ ڈینجر ان کشمیر

[2] الاصلاح سری نگر ، ۲۴ر جون ۱۹۴۶ء [3] الاصلاح ، سری نگر ، ۴ر جولائی ۱۹۴۶ء

غلام نبی گلکار قادیانی کو کشمیر میں انڈر گراؤنڈ حکومت بنانے کا کام سونپا گیا - لیکن یہ سازش کامیاب نہ ہو سکی بعد میں گلکار نے نہایت ڈھٹائی سے دعویٰ کر دیا کہ وہ آزاد کشمیر حکومت کے بانی ہیں - اس عظیم قادیانی جھوٹ سے کئی مسلم زعماء نے پردہ اٹھایا ہے - اور حکومت آزاد کشمیر کو تشکیل دینے والے رہنما سردار ابراہیم خان، سید نذیر حسین شاہ اور دیگر کشمیری زعماء بقید حیات ہیں - لیکن کشمیر کی آزادی کی تاریخ کو مسخ کرنے کیلئے قادیانی اپنی روش پر قائم ہیں -

انڈر گراؤنڈ حکومت کی سازش کے ناکام ہونے کے بعد مرزا محمود نے تقسیم کے بعد کے پر آشوب حالات میں بہت سے دورے کئے، مغربی پاکستان کے مختلف شہروں میں جلسوں سے خطاب کیا - اور مسئلہ کشمیر پر روشنی ڈالی[۱] اس سازش کی ایک کڑی مہاجرین کی انجمن کا قیام تھا جس کا مقصد مسلم کانفرنس کے اثر کو کم کرنا اور مہاجرین کی فاقہ کشی سے فائدہ اٹھانا تھا - اس پلیٹ فارم کو قادیانیوں نے قائد ملت، چوہدری غلام عباس اور مسلم کانفرنس رہنماؤں کے خلاف استعمال کیا - اس انجمن کے اخراجات مرزا محمود برداشت کرتے تھے مسلم کانفرنس نے جب اس سازش سے پردہ اٹھایا تو مرزا محمود نے اس انجمن سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا، لیکن اب جو قادیانی تاریخ مرتب ہوئی ہے - اس میں تسلیم کیا گیا ہے کہ مرزا محمود" اس انجمن کے جملہ اخراجات کے کفیل تھے :[۲]

قادیانیوں نے یہیں تک بس نہیں کیا بلکہ فرقان بٹالین تشکیل دی تاکہ مسلح ہو کر اپنے مذموم اور شرمناک سیاسی مقاصد کی تکمیل کی جا سکے -

"تنسیخ جہاد کا عقیدہ رکھنے والی امت مرزائیہ نے فرقان بٹالین کے نام پر مرزائیوں کی جو فوج بنا کر جہاد کشمیر میں جو کچھ کیا اور ہندوستان کی جو خدمات انجام دیں مسلم مجاہدین کی جوانیوں کا جس شرمناک طریق پر سودا چکایا، اس پر خون کے آنسو بھی بہائے جائیں تو کم ہیں - مجاہدین کے کیمپ میں جو سکیم بنتی، فوراً ہندوستان پہنچ جاتی، جہاں مجاہدین مورچے بناتے دشمن کو پتہ چل جاتا، اور جہاں مجاہدین ٹھکانہ کرتے، وہیں ہندوستانی ہوائی جہاز پہنچ جاتے "[۳]

فرقان بٹالین کی کمان موجودہ قادیانی خلیفہ مرزا ناصر احمد کے ہاتھ تھی - جب اس تنظیم کی غدارانہ کارروائیوں

۱؎ تاریخ احمدیت جلد یازدھم، ۲؎ تاریخ احمدیت جلد ششم -

۳؎ روزنامہ آزاد لاہور، مورخہ ۷ / اپریل ۱۹۵۰ء

کا پتہ چلا تو مسلم کانفرنس کے متقدرہ زعماء نے حکومت پاکستان سے مطالبہ کیا کہ اس نام نہاد فوج کو ختم کیا جائے سردار آفتاب احمد جنرل سیکرٹری مسلم کانفرنس کشمیر نے ایک تقریر کے دوران کہا کہ مرزائیوں نے غداری کے طور پر فرقان فورس بھیجی تھی۔ یہ لوگ خفیہ خبریں ہندوستانی فوجوں تک پہنچاتے تھے۔ اپنی شرمناک کاروائیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے مرزا محمود نے اس وقت کے کمانڈر ان چیف جنرل گریسی سے اپنے حق میں ایک تحریر حاصل کی جس میں اس نے لکھا کہ فرقان فورس نے شاندار خدمت کی ہے۔ واضح رہے کہ جنرل گریسی نے قائداعظمؒ کے حکم کے باوجود کشمیر میں فوجیں داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جب کہ بھارت پوری جارحیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ قائداعظم کو یہ دھمکی بھی دی گئی۔ کہ اگر انہوں نے فوج کشی کا حکم دیا تو تمام برطانوی افسروں کو فوج سے نکال لیا جائے گا۔ (TWO NATIONS & KASHMIR)

غرضیکہ قادیانیوں کی کشمیر میں دلچسپی کشمیر کی مخصوص جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے تھی اور انگریزوں کا مفاد اسی میں تھا کہ اس علاقے پر قادیانی متصرف ہو جائیں۔ پاکستان کے قیام کے وقت ایک طرف کانگرس کشمیر پر قابض ہونے کے لئے ساز باز کر رہی تھی تو دوسری طرف قادیانی اس ریاست پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ قادیانیوں نے عین موقع پر مسلمانوں کے مفادات کو سبوتاژ کیا۔ اور تحریک آزادی کو سخت نقصان پہنچایا۔ رہی سہی کسر ظفر اللہ نے نکال دی جب کہ مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں زیر بحث تھا۔ میاں افتخار الدین نے ۱۹۵۰ء میں آئین ساز اسمبلی میں اپنی تقریر کے دوران کہا:

"سر ظفر اللہ ایک قابل وکیل ہو سکتا ہے، جسکا ۳۰ سالہ تجربہ ہے اور جو برطانوی راج کا مداح رہا ہے۔ برطانیہ کا اس قدر وفادار جتنا خود شہنشاہ بھی نہ ہو۔ اس نے تیس ۳۰ سال کے عرصہ میں ایک بار بھی آزادی کا مطالبہ نہ کیا۔ اس نے تمام عمر برطانوی حکومت کی مدد کی۔ یہ شخص روپیہ حاصل کرکے بہاولپور اور بھوپال کے لئے بول سکتا ہے۔ حتیٰ کہ حکومت ہند کے حق میں بھی بول سکتا ہے۔ یہ شخص ہندوستان کے سیاسی نمائندے کے طور پر جا کر بول سکتا ہے۔ اگر اس کو معاوضہ دیا جائے جس طرح کہ روپیہ لے کر اس نے چین کے ساتھ (برطانوی دور) میں کہا۔ اس طرح یہ پاکستانی حکومت کی طرف سے پیسہ لے کر کام کر رہا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو خدانخواستہ متحدہ ہندوستانی حکومت بن جائے تو اس کا موقف بھی پیسہ لیکر پیش کر سکتا ہے۔ اس شخص نے ۳۰ سال برطانوی سامراج کی خدمت کی۔ یہ وہ وکیل ہے جو رسوائے زمانہ جماعت یونینسٹ پارٹی کا فکری رہنما تھا۔ جو برصغیر کی رجعت پسند جماعت تھی یہ شخص آزادی کی تڑپ کو کیسے محسوس کر سکتا ہے، اور کشمیریوں کے جذبات کا کیا اندازہ لگا سکتا ہے یہ ان کیلئے نہیں مر سکتا یہ بال کی کھال اتار سکتا ہے۔ یہ شخص کوئی پالیسی وضع نہیں کر سکتا۔" ـــــــ دراصل یہ قادیانیوں اور سر ظفر اللہ کی ابتدائی دور کی سازشیں تھیں کہ مسئلہ کشمیر حل نہ ہو سکا۔

تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں؟

بارگاہ رسالت میں التجا والتماس

ہر ہر عضو گرا ہوا تھا، چلنا پھرنا تو دور کی بات ہے، قسم ہے اس خدائے زندہ وتوانا کی، جو مردوں سے زندوں کو اور زندوں کو مردوں سے نکالتا ہے کہ ایک سکنڈ دو سکنڈ کے لئے بھی بیٹھنے کی آرزو جس سیاہ بخت کے لئے مہینوں سے صرف آرزو بنی ہوئی تھی، بخت کی بیداری کے بعد دیکھا جارہا تھا، کہ اب وہ اٹھ رہا ہے، اٹھتا چلا جا رہا ہے، جسکی موت کا فیصلہ کیا جاچکا تھا۔ وہ دوبارہ گویا زندوں میں پھر شریک کردیا گیا ہسپتال والوں نے چند ہی دنوں بعد حکم دے دیا کہ اب یہاں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حکم کی تعمیل کی گئی، پھر آگے کیا قصے پیش آئے ان کی تفصیل غیر ضروری ہے شعور اور احساس میں ایک خیال کے سوا دوسرا خیال یا ایک جذبہ کے سوا دوسرا کوئی جذبہ باقی نہ رہا تھا۔ اس زمانے میں بہار میں تھا، بہار کی دیسی آبادی جو دیہاتوں میں رہتی ہے ایک خاص قسم کی زبان بولتی ہے۔ اس زبان میں اور کچھ ہو یا نہ ہو، لیکن التجا والتماس کے لئے اس کا پیرایہ حد سے زیادہ موزوں اور مناسب ہے، بے ساختہ اسی زبان میں کچھ مصرعے ابلنے لگے، سن کر تو اردو زبان کے سمجھنے والے بھی اسکو شاید سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن اردو زبان کے املائے حدود میں مگدھی یا بہاری زبان مروجہ کے ان الفاظ کو لانا دشوار ہے۔ کتابی شکل میں صحیح طور پر جیسا کہ چاہئے شاید وہ سمجھے بھی نہیں جاسکتے لیکن عرض چونکہ اسی زبان میں کیا گیا تھا۔ بجنسہ ان ہی الفاظ کو (نیچے) نقل کردیتا ہوں ——— "درشن" کی آرزو اس عجیب وغریب اضطراری نظم کی روح تھی، بہار کے نائب امیر شریعت مولانا سجاد مرحوم اگرچہ بظاہر

نقیہ النفس والصورت تھے۔ مگر ذاتی تجربہ کے بعد یہ ماننا پڑتا تھا کہ باطن ان کا فقیہ سے زیادہ فقیر تھا۔ قرابت کے تعلقات کی وجہ سے گیلانی بھی کبھی تشریف لاتے تھے اسی زمانہ میں اتفاقاً ان کی تشریف آوری ہوئی، اس نظم کے سننے کا موقعہ ان کو بھی ملا، سنتے جاتے تھے، اور روتے جاتے تھے، خصوصیت کے ساتھ اس بند پہ تڑپ تڑپ گئے، ہچکیاں ان کی بندھ گئیں، یعنی دوسرا بند۔

تمری دوار یا کیسے چھوڑدوں تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں تم رے نگر میں دم بھی توڑوں

جی کا اب ارمان یہی ہے
اٹھوں پھر اب دھیان یہی ہے

"تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں" اس ستفہامی مصرعہ کو بار بار دھراتے اور بے قرار ہو ہو کر بلبلاتے، اور ہے بھی یہ سوال کچھ اس قسم کا، آج انسانیت زمین کے اس خاکی کرّے پر تڑپ رہی ہے۔ زندگی کا مطلب کیا ہے۔؟ اس سوال کو حل کرنا چاہتی ہے ایک ڈیوڑھی کے سوا خود ہی سوچئے کہ دنیا میں کون سا آستانہ ایسا باقی رہا ہے، جہاں واقعی اس سوال کے جواب کی صحیح توقع کی جائے۔؟ اس تنہا واحد آستانے سے ٹوٹنے والا خود سوچے کہ کہاں جائے گا۔ کن کے پاس جائے گا۔ موسیٰ ہوں یا عیسیٰ، ابراہیم ہوں، یا یعقوب علیہم السلام یا ان کے سوا کوئی اور اس راہ کے ان سب راہبروں نے اپنے اپنے وقتوں میں جو راہ پیش کی تھی۔ جب وہ ساری راہیں مسدود ہو چکی ہیں، تاریخ جانتی ہے کہ ڈھونڈھنے والوں کو ان بزرگوں کی بتائی ہوئی راہ نہیں مل سکتی، تو اب دنیا کہاں جائے۔ اور اس کے سوا کہ جلوۂ ات تعبیر خواب زندگی (اقبال) کا فیصلہ کرتے ہوئے "تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں" کہتا ہوا اسی چوکھٹ کے ساتھ چمٹ جائے، جس کے سوا شہادت والوں کو غیب تک پہنچنے اور پہنچانے کا کوئی دوسرا ذریعہ باقی نہیں رہا ہے۔ (مناظر احسن گیلانی)

پیارے محمد جگ کے سجن تم پر واروں تن من دھن
تمری صورتیا من موہن کبھیو کرا ہو[1] تو درشن

جیا کنھرے[2] دکوا تر سے
کرپا کے بدرا[3] کہیا[4] برسے

---

[1] کبھی کرا دیجئے [2] کڑھتا ہے دل [3] بادل [4] کب

تمری دوار یا کیسے چھوڑوں　　تم سے توڑوں تو کس سے جوڑوں
تمری گلی کی دھول بٹوروں　　تمرے نگر میں دم بھی توڑوں
جی کا اب ارمان یہی ہے
اٹھوں پھر اب دھیان یہی ہے

صلی اللہ علیک نبیا　　تمرے دوارے آیا دکھیا
بھنیا[۱] اکی پکڑھو راجا　　اپنے حسین وحسن کا صدقا
ڈھوا[۲] گھریں ناؤ کو اس کے
اب نہیں ہم ہیں اپنے بس کے

سیس پہ اکے پاداں[۳] دھرہو　　پیت کی اگیا من میں بھرہو
بھدرہوا[۴] پہ تنی[۵] کرپا[۶] کرہو[۷]　　سپنو میں ایسن[۸] کر گجرھو[۹]
راجا تمری دیوڑھی بڑی ہے
رحمت تمرے نام پڑی ہے

اندھراکے[۱۰] تم رہیا بتاہو[۱۱]　　ہردے[۱۲] کا اِکے جوت جگاہو
ڈگری[۱۳] پہ اپنے اکو چلاہو　　بودھا کے[۱۴] تم بُدھی[۱۵] بناہو
کھینچو اکو پاپ نرکھ سے
دھو دیہو کا[۱۶] ٹیکھ منھ کا اکے۔

تمرے پیا کی اونچی اٹریا　　ہمری نے ہی داں پہ گجریا
تلا[۱۷] تلا رہی نجر[۱۸] یا　　پکھلئی[۱۹] ہے اک تمری دواریا
اُن کھر[۲۰] پتوا[۲۱] تمرے سے چلی ہے
کھوجوا[۲۲] بھی اُن کا تمرے سے ملی ہے

پی کی پتیا[۲۳] تم ہی لے لہو　　ان کھر بتیا[۲۴] تم ہی سنی لہو
ہمنی کے نندیا سے تم جگئے لہو[۲۵]　　مرل[۲۶] تھلبئی تم ہی جلئے[۲۷] لہو
دھرمی[۲۸] بھئے لوں تم ری دیا[۲۹] سے
مکتی[۳۰] بھی ہو ای ہی تمری دوا[۳۱] سے

---

۱ بازو ۲ موج عظیم ۳ پاؤں ۴ حد درجہ بدبخت ۵ ذرا ۶ مہربانی ۷ کیجئے ۸ ایسا ۹ کر گذریئے۔ ۱۰ اندھے کو ۱۱ بتائیے ۱۲ قوئی باطنی ۱۳ راستہ ۱۴ بیوقوف کو ۱۵ دانش مند بنا دیجئے۔ ۱۶ سیاہی ۱۷ بھٹک ۱۸ نظر ۱۹ دکھیی ہوئی ہے۔ ۲۰ ان کا ۲۱ پتہ ۲۲ سراغ ۲۳ خط ۲۴ باتیں ۲۵ جگایا ۲۶ مرے ہوئے تھے۔ ۲۸ موہن ہوئے۔ ۲۹ مہربانی سے ۳۰ نجات بھی ہوگی ۳۱ آپ کی ہی دعا سے۔ ۲۷ جلایا۔

مسلمانوں کا فنِ کتاب سازی و کتاب داری

احمد خان ایم۔ اے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ اسلام آباد
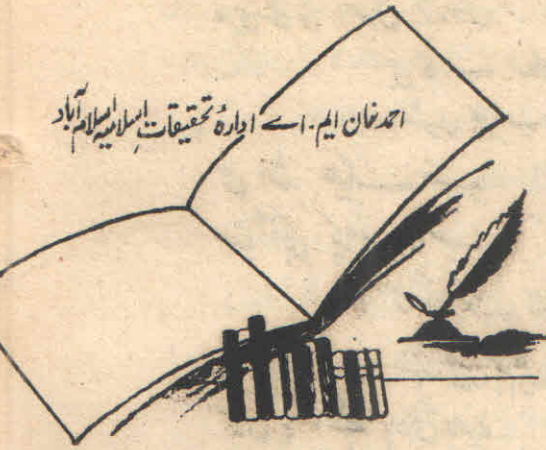
کتاب سے دلچسپی، اس کی کتابت، کتاب کیلئے کونسا مواد استعمال کیا جائے، اس کی تصیح، اس کے لئے خط کا چناؤ، فصول میں تقسیم، کتابت کی تاریخ کا تحریر کرنا (COLOPHON)، کتابیں جمع کرنا، مستعار لینا دینا اس کے مطالعے کے آداب اور کتابوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں جو کچھ کام کیا گیا ہے کتاب سازی (BOOK PRODUCTION) کہلاتا ہے۔ علاوہ بریں کتابوں کو افادہ عام کے لئے مہیا کرنے انہیں طالبانِ علم و دانش تک پہنچانے، کتب خانوں میں مرتب کرنے اور رکھنے کے انداز سے متعلق امور کتاب داری کہلاتے ہیں۔ ان دونوں فنون میں مسلمانوں نے جو کام کیا ہے اس سے متعلق معلومات، اسلامی ادب میں بکھری ہوئی ہیں، مگر ان تمام معلومات کی جامع تصنیف تذکرۃ السامع والمتکلم فی آداب العالم والمتعلم، ہے۔ (۱) یہ کتاب اگرچہ آٹھویں صدی ہجری میں تالیف ہوئی مگر اس کے مصنف نے متقدمین کی اس فن سے متعلق تقریباً تمام معلومات جمع کر دی ہیں۔ اس کتاب پر مبنی یہ معلومات اختصار کے ساتھ پیش

۱؎ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۵۳ھ، اس کے مصنف بدرالدین محمد بن ابراہیم بن سعد اللہ بن جماعت اپنے عہد کے بہت بڑے عالم تھے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اس فن میں ان کی یہ بہت عمدہ کتاب ہے۔ اس کے یہ ابواب ہیں۔ ۱۔ فضل العلم و اھلہ و شرف العلم و نسلہ۔ ۲۔ فی ادب العالم فی نفسہ و مراعاۃ طالبہ و درسہ۔ ۳۔ فی ادب المتعلم فی نفسہ و مع شیخہ و رفقتہ و درسہ۔ ۴۔ فی مصاحبۃ الکتب وما یتعلق بہا من الادب۔ ۵۔ فی ادب سکنی المدارس للمنتہی والطالب۔ اس کا چوتھا باب ہمارے متعلق ہے۔

کی جا رہی ہیں [1]

کتاب، علم کے حصول کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ اس لئے طالب علم کیلئے ضروری ہے کہ جس کتاب کی ضرورت ہو اسے ہر ممکن صورت میں حاصل کرے، چاہے مستعار لے یا اسے کہیں سے خریدے۔ اگر یہ دونوں صورتیں محال ہوں تو خود اپنے ہاتھ سے نقل کرے۔ نقل کرتے وقت زیادہ اس کتاب کی صحت کا خیال رکھا کرتے۔ اس میں تحسین خط کی چنداں ضرورت محسوس نہ کی جاتی۔ اور اگر کسی صاحب کا خط اچھا ہوتا۔ اور وہ تیز بھی لکھتا تو یہ امر اس کیلئے خوبی اور قابل تحسین عمل گردانا جاتا۔ لکھنے والے اس بات کا بھی ضرور خیال رکھتے کہ کاغذ زیادہ خرچ نہ ہو۔ اس لئے وہ تحریر کرتے وقت چھوٹے حروف لکھتے، مگر اس قدر کہ پڑھا جا سکے ــــــ۔

کتاب کو افادۂ عام کیلئے عاریۃً دینے کے بارے میں ایک ضابطۂ اخلاق بنا ہوا تھا کہ مستعار لینے والے اور دینے والے دونوں کو کتاب کے لینے دینے میں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچنا چاہئے۔ کتاب صرف حاجت کی صورت میں مستعار لینی چاہیئے۔ یہ خیال رہے کہ مستعار لینے والا مستعار دینے والے کا شکریہ بھی ادا کرے۔ بغیر ضرورت کتاب کو اپنے ہاں بند نہ رکھا جائے۔ جب ضرورت پوری ہو جائے کتاب کو فوراً لوٹا دیا جائے ــــــ مستعار لی ہوئی کتاب میں اگر کسی قسم کی غلطی یا سقم ہو تو بغیر مالک کی اجازت کے اس میں درستی نہ کی جائے۔ کتاب کے حاشیے پر، ابتداء یا آخر میں کسی قسم کی عبارت نہ بڑھائی جائے۔

اگر کتاب وقف ہے تو اس کی نقلیں کی جا سکتی ہیں۔ مگر خاص احتیاط برتی جائے، خیال رہے کہ اصل نسخے میں اصلاح وتصحیح نہ کی جائے۔ اگر اس قسم کی ضرورت محسوس ہو تو وقف کے مہتمم سے اجازت حاصل کی جائے نقل کرتے وقت اس کتاب کو روشنائی سے دور رکھا جائے تاکہ اس پر سیاہی نہ گر پڑے۔ ایک شاعر نے اسی ضمن میں کہا ہے ؎

ایہا المستعیر منی کتابا ارض لی فیہ ما لنفسہ ترضی

(مجھ سے کتاب مستعار لینے والے اس کو اسی طرح رکھو جس طرح تو اپنے لئے چاہتا ہے)

کتاب کا مطالعہ کرتے وقت جن امور کا خیال رکھنا چاہئے، ان کے بارے میں ابن نے پوری تفصیل سے لکھا ہے۔ کتاب کو پڑھتے وقت اسے زمین پر کھلا نہ رکھا جائے، بلکہ اس کو سہارا

---

[1] اس اختصار سے ہرگز یہ مطلب نہیں نکلتا کہ مسلمانوں کے ہاں اس فن میں بھی کچھ کام ہوا ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ کام ہو چکا ہے۔ جو مختلف تالیفات میں بکھرا پڑا ہے۔

دینے کیلئے دونوں طرف کتابیں یا رحل استعمال کریں۔ زمین پر یونہی نہ رکھ دیں ورنہ اس میں نمی و تمازت کا اثر ہو جائے گا جس سے کتاب کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ جب کتاب کو کسی جگہ رکھیں تو اس کی جلد کو نقصان پہنچانے والی چیزوں سے بچایا جائے۔

مقریزی نے ایک صاحب کی روایت سے ایک کتب خانے میں کتابیں رکھنے کا انداز اور انکی ترتیب کے بارے بتایا ہے، جس سے ازمنہ وسطی میں مسلمانوں کے کتب خانوں میں تنظیم کے بارے میں کافی روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: کہ ایک ہسپتال کے ساتھ ایک کتب خانہ تھا۔ اس کتب خانے کے مختلف کمروں میں کئی الماریاں تھیں ان الماریوں کے مابین حاجز (PARTITION) تھے۔ ہر حاجز پر ایک مقفل دروازہ لگا ہوا تھا۔ ان الماریوں میں ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں تھیں۔ جو کئی مکتب فکر کے فقہ، نحو، لغت، حدیث، تاریخ، سیر الملوک، علم ہیئت، روحانیت اور کیمیا پر مشتمل تھیں۔ ہر حاجز کے دروازے پر ایک ورق لٹکا ہوا ہوتا تھا جس پر الماریوں میں کتابوں کی تفصیل درج ہوتی تھی۔[سے]

ادب کا یہ تقاضا ہے کہ کتابیں، علوم، ان کے مشرف اور ان کے مصنفین اور ان کے علو مرتبت کے اعتبار سے رکھی جائیں۔ سب سے زیادہ مقدس و مکرم کتاب سب سے اونچی جگہ پر رکھی جائے اس کے بعد تدریجاً نیچے رکھی جائیں۔ سب سے اونچی جگہ پر قرآن کریم ہو، جو صاف ہونے کے علاوہ پاک بھی ہو۔ اور وہ مقام بیٹھنے کی جگہ کے قریب بھی ہو۔ اس کے بعد یہ ترتیب ہو: کتب حدیث، تفسیر، تفسیر حدیث اصول دین، اصول فقہ، فقہ (تمام مکاتب فکر کا) نحو عربی، صرف، اشعار عرب اور آخر میں عروض۔ اس ترتیب سے اس امر کا بھی علم ہوتا ہے کہ تب مسلمان کتب خانے میں کتابیں کن کن مضامین میں تقسیم کر کے رکھا کرتے تھے۔ اور پھر انہیں کس ترتیب سے الماریوں میں رکھا جاتا تھا۔ اس کے بعد ابن جماعۃ کتابوں کی ایک الماری کی ترتیب پر روشنی ڈالتے ہوئے بتاتے ہیں:

" الماری میں پہلا درجہ اس کتاب کو حاصل ہوگا جس میں قرآن یا حدیث کو زیادہ زیر بحث لایا گیا ہو۔ اور اگر اس امر میں بھی برابر ہوں تو پھر مصنف کے علو و جلالت کے اعتبار سے۔ اگر اس میں بھی برابر ہوں تو کتابت میں قدیم تر کتاب پہلے رکھی جائے گی۔ اور ساتھ ہی یہ بھی خیال رکھا جائے گا۔ کہ کونسی کتاب قارئین اور طالبان علم کے زیر مطالعہ زیادہ رہتی ہے۔ اور اگر اس معاملے میں بھی برابر ہوں تو پہلا درجہ اس کتاب کو حاصل

[سے] یہ تفصیل ابن جماعۃ کی مذکورہ کتاب کے صفحہ ۱۷۱ پر حاشیے میں مندرج ہے۔ ویسے اسے مقریزی کی کتاب الخطط (مطبوعہ مصر) جلد ۱ صفحہ ۴۰۹ پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

ہوگا۔ جو صحت کے اعتبار سے دونوں میں عمدہ ہو۔"

اس بیان سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آج کل کے نظام و ترتیب کی نسبت کسی کتاب کو الماری میں مرتب کرنے کی طرف دھیان دیتے ہوئے کس قدر باریکیوں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ آج کل کتاب کو الماری میں لگاتے ہوئے تو صرف ایک بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ مصنفین کے نام کے حروف تہجی کے اعتبار سے جو نمبر آتا ہے، اسی جگہ کتاب کو رکھا جاتا ہے۔ مگر اس وقت بیک وقت چار امور کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تب کتاب کی الماری (STACK) میں ترتیب اور رکھائی میں جس قدر توجہ اور اہمیت دی جاتی تھی۔ آج اس کا صرف چوتھا ہے۔ اس امر سے ہمیں سروکار نہیں کہ وہ ترتیب کافی پیچیدہ ہوتی تھی۔ جسے سمجھنے کیلئے ایک عالم درکار تھا۔ بہرحال جتنا کوئی کام پیچیدہ ہوتا ہے۔ اتنا ہی وہ سمجھنے والے کے ذہن کی بلندی پر دلالت کرتا ہے۔

کتاب کو الماری میں رکھنے کے بعد اس پر رکھنے کی جگہ اور دیگر نشانات از قسم مضمون و مصنف (جو آج کل پشتے (spine) پر لگائے جاتے ہیں۔ تاکہ کتاب کو تلاش کرنے میں اور واپس رکھنے میں سہولت رہے) لگانے کی یہ تفصیل دی گئی ہے: کتاب کے آخری صفحات کے نیچے کے حصے میں کتاب کا عنوان تحریر کیا جائے۔ اس عنوان کے الفاظ کے ابتدائی حروف لیکر ابتداء میں کور (COVER) پر لکھے جائیں اس عمل کا یہ فائدہ ہوگا، کہ کتاب کے پہچاننے اور اسے الماری سے نکالنے میں غایت درجہ سہولت رہے گی۔ جب کتاب نیچے یا کسی لکڑی کی چوکی پر رکھی جائے تو وہ کور ابتداء میں ہوگا۔ اور کتاب کا ابتدائی حصہ اوپر رہے گا۔ غلاف کا دائیں جانب بڑھا ہوا حصہ زیادہ لمبا نہ ہو، تاکہ جلدی ٹوٹ نہ جائے۔ اس طرح بڑی تقطیع کی کتاب چھوٹی تقطیع کی کتاب پر نہ رکھی جائے۔ کتاب میں کاغذ وغیرہ بھی نہ رکھے جائیں اور نہ ہی کتاب کو تکیے، پنکھے یا دیگر کسی سہارے کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اس کے صفحات کے کونے بھی نہ موڑے جائیں۔

کتاب مستعار لینے کے بارے میں بتاتے ہیں کہ: جب کوئی شخص کتاب مستعار لے تو اچھی طرح دیکھ بھال کرے کہ وہ صحیح اور درست حالت میں ہے۔ اسی طرح جب خریدے تو اس کی ابتداء، آخر، وسط اور اس کے اجزاء اور اوراق کو اچھی طرح دیکھ لے۔

کسی کتاب کو نقل کرنے کے آداب پر روشنی ڈالتے ہیں: سب سے پہلے بسم اللہ تحریر کریں۔ پھر رسولؐ پر درود اور یہ درود و سلام خاتمہ کتاب پر بھی ہوں۔ کس طرح کا کاغذ استعمال کیا جائے، قلم کیسا ہو، اس کے بنانے کا طریقہ کیا ہو۔ روشنائی کونسی استعمال کریں۔ دیرپا رہنے والی روشنائی کیسے تیار

کی جاتی ہے۔ باریک نکسیں یا جلی قلم سے۔ کہاں سرخ روشنائی استعمال کریں اور کہاں سیاہ۔ کتاب کی صحت کے کیا قوائد ہیں۔ اسماء کو اشکال کیساتھ کس طرح منضبط کریں۔ اعجام کی کیا کیا صورتیں ہوں۔ حواشی پر کیا لکھا جائے، وغیرہ وغیرہ تمام امور پر ابن جماعۃ نے روشنی ڈالی ہے۔ الغرض مسلمانوں کی کتاب سازی وکتابداری پر مصنف موصوف نے بہت اچھی تفصیل دی ہے۔ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے واحد کتاب ہے۔

اس کتاب کے مطالعے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں یہ فن بہت ترقی یافتہ شکل میں موجود تھا اور یہ کہ وہ نہ صرف اس میدان میں آگے تھے۔ بلکہ جدید ترین وسائل سے بھی کام لے رہے تھے۔

مشاہیر علمائے سرحد

قسط نمبر ۲

میری علمی و مطالعاتی زندگی

سلسلہ نمبر ۱

ایک بقیۃ السلف عالم دین

علامہ مولانا

مارتونگ صاحب مدظلہ

کی

کہانی اُنکی اپنی زبانی

راوی :- صاحب سوانح مدظلہ

روایت :- مولانا فضل مولی صاحب مدرس دارالعلوم حقانیہ

ترجمہ :- ادارۃ الحق

دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۳۵ھ میں میں دارالعلوم دیوبند گیا، میں نے داخلہ امتحان کیلئے فارم میں تین کتابیں لکھیں - ۱- قاضی - ۲- شرح اشارات - ۳- شرح چغمینی -

مولانا انور شاہ کشمیریؒ میرے امتحان داخلہ کیلئے حضرت کشمیریؒ (شاہ انور شاہ علیہ الرحمۃ) تجویز کئے گئے - جس وقت میں امتحان دینے انکی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے قاضی کے مبحث تشکیک میں لاتشکیک فی الماہیات سے شروع فرمایا۔ اور اما انتفاء الماھیۃ - تک تقریباً ایک صفحہ میں میں نے حضرت والاشانؒ کو امتحان دیا، اس کے بعد حضرت والاشان نے کتاب بند فرمائی اور یاد سے منتشر سوالات شروع کئے، میں نے اس کے مناسب جوابات دیئے، اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ امتحان کی دو کتابیں اور باقی ہیں تو حضرت نے فرمایا کہ معلومیۃ قابلیت کیلئے ایک کتاب کا امتحان کافی ہے۔ اس لئے باقی دو کتابوں میں امتحان نہ ہوا۔ پھر دریافت فرمایا کہ اس سال یہاں دارالعلوم میں آپ کونسی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ مشکوٰۃ شریف، جلالین شریف ہدایہ مکمل اور توضیح - تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ دورۂ حدیث کیلئے متنبی کا پڑھنا بھی ضروری ہے، اس لئے متنبی بھی پڑھ لیں۔ اسی دن سے میرا کھانا مطبخ سے جاری ہوا — اور نمبرات کے لحاظ سے میں عمدہ درجہ میں کامیاب ہوا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی میرے اسباق کی ترمیم و ترتیب حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کے حوالہ تھی، انہوں نے مجھ سے کتابوں کے بارہ میں دریافت کیا تو میں نے ان کتابوں کا نام لیا۔ جو حضرت شاہ صاحب مرحوم

کے سامنے لیا تھا۔ تو مولانا شبیر احمد صاحب نے پوچھا کہ جب ہدایہ مکمل پڑھنا چاہتے ہیں۔ تو کیا شرح وقایہ آپ نے پڑھی ہے، میں نے عرض کیا کہ شرح وقایہ تو کیا میں نے کنز الدقائق بھی نہیں پڑھی تو فرمایا کہ جب شرح وقایہ اور کنز بھی نہیں پڑھے تو ہدایہ مکمل کس طرح لے سکتے ہیں۔؟ تو میں نے جواب میں کہا کہ آپ اپنے اس دارالعلوم کے کسی مکمل طالب العلم کو بلائیں کہ ہدایہ پڑھ چکا ہو۔ اور اعلیٰ طریقہ سے کامیاب بھی ہوا ہے۔ پھر مجھے اور ان کو ۵ منٹ کی فرصت دیکر کسی مشکل جگہ کو متعین فرماکر بعد میں دونوں سے امتحان لیں اور ہم دونوں کا موازنہ کر لیں۔ مولانا شبیر احمد صاحب نے فرمایا کہ آپ کی قابلیت میں کوئی شک نہیں کہ جب آپ نے امتحان کے لئے شرح اشارات اور قاضی کا نام لکھا ہے۔ اور پھر قاضی میں حضرت شاہ صاحب کا امتحان دیکر عمدہ نمبرات سے کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ مگر یہ ترتیب ہمارے دارالعلوم کے اصول کے خلاف ہے کہ شرح وقایہ نہ پڑھی ہو اور اسے ہدایہ میں شریک کر لیا جائے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کا یہ قانون غلط ہے۔ اس وجہ سے کہ اس میں مراتب اذہان کی تفاوت کی رعایت نہیں۔ تو انہوں نے منطق لہجہ میں فرمایا کہ کیا وجہ ہے کہ آپ دینیات میں مرکز خاک پر ہیں۔ اور معقولات میں محدب فلک الافلاک پر ہیں۔ تو میں نے جواباً کہا کہ اس لئے کہ معقولات مبادی ہیں۔ اور دینیات مقاصد اور مبادی، مقاصد پر طبعاً مقدم ہوتے ہیں۔ لہذا میں نے وضعاً بھی اسے مقدم رکھا ہے۔ اس لئے کہ وضع کی مطابقت طبع کے ساتھ ہو سکے۔ پھر آپ نے سوال کیا کہ آپ نے کونسی شرح اشارات پڑھی ہے۔ امام رازیؒ کی یا طوسی کی۔؟ تو میں نے جواب میں قصداً ابہام سے کام لے کر کہا کہ جو شرح اشارات مدارس میں مروّج ہے۔ اسی کو پڑھ چکا ہوں تو فرمایا کہ میں اُسی ہی کو متعین کرنے کا پوچھتا ہوں۔ تو میں نے کہا کہ آپ کے دارالعلوم کا جو بلند و بالا نصاب ہے۔ خود آپ کے سامنے ہے۔ پھر مجھے اس کے تعین کی کیا ضرورت ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ جب آپ ناراض ہو رہے ہیں۔ تو میں نائب مہتمم مولانا حبیب الرحمان صاحب مرحوم سے آپ کو ہدایہ میں شمولیت کی اجازت لے لوں گا۔ میری خفگی حضرت مولانا نے میرے مذکورہ جوابات سے محسوس فرمائی۔

دیوبند سے امروہہ | مگر ابھی اسباق شروع نہیں ہوئے تھے کہ دیوبند کی آب و ہوا کی عدم موافقت کی وجہ سے میں بیمار ہو گیا۔ تو میں نے بعض معتمد طلباء سے مشورہ کیا۔ انہوں نے یہ رائے دی کہ امروہہ ضلع مرادآباد کی آب و ہوا بڑی عمدہ ہے۔

مولانا حافظ عبدالرحمان امروہی | وہاں کے مدرسہ کے صدر مولانا حافظ عبدالرحمان امروہی مشاہیر مفسرین اور اکابر محدثین میں سے ہیں۔ آپ جلالین شریف میں حضرت حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور احادیث میں حضرت گنگوہیؒ کے براہ راست شاگرد تھے۔ تو میں امروہہ چلا گیا۔ وہاں میری صحت بالکل ٹھیک

ہوگئی۔ امتحان داخلہ میں پہلے نمبر پر کامیاب ہوکر داخل مدرسہ ہوگیا۔ مشکوٰۃ شریف میں نے یہاں مولانا رضا حسن صاحب سے پڑھی، جو حضرت مولانا سید احمد حسن امروہی کے بھتیجے تھے۔ اور مولانا احمد حسن مرحوم احادیث میں حضرت گنگوہیؒ کے بالذات شاگرد تھے اور اپنے وقت میں مشاہیر اور اکابر محدثین اور معقول علماء میں سے تھے۔ اور اپنے دور کے کامل اولیاء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی کا ارشاد یہ بات مشہور تھی کہ مولانا احمد حسن پر جلالی شان غالب تھی، اور ان کے ساتھی حضرت شیخ الہند پر جمالیت کا غلبہ تھا۔ اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرمایا کرتے تھے کہ ان دونوں میں سے ایک میری عینِ یمنی (داہنی آنکھ) اور دوسری عینِ یسری (بائیں آنکھ) ہے اور یہ تعیّن نہ فرماتے کہ کون عین یمن ہے، اور کون عین الیسر — توضیح اور ہدایہ اوّلین غالباً مولانا امین الدین سے شروع کی اور ہدایہ اخیرین تفسیر بیضاوی اور جلالین شریف حضرت والاشان مولانا حافظ عبدالرحمان صاحب سے شروع کیں۔ ایک کتاب ختم ہونے کے بعد دیوان متنبی بھی حضرت حافظ صاحبؒ سے پڑھی، تقریباً دو ماہ گذرے تھے۔ کہ مولانا امین الدین صاحب کو جو بہت بڑے حکیم تھے۔ حکیم اجمل خاں صاحب نے دہلی اپنے طبیّہ کالج کیلئے طلب کیا۔ ان کے جانے سے جگہ خالی رہ گئی۔

طالب علمی میں تدریس اس وقت تک درجۂ علیا کے طلبہ مجھ سے خارجی اوقات میں معقولات کی اہم کتابیں پڑھنے لگے تھے۔ اور حضرت مولانا امروہی سے میری بڑی تعریفیں کرتے تو حضرت مولانا نے مجھے فرمایا کہ چونکہ نائب صدر چلے گئے۔ ان سے آپ توضیح پڑھتے تھے۔ وہ اب میں پڑھاؤں گا۔ اور ان کے ذمہ معقولات کے علاوہ دیگر کتابیں باقی مدرسین اور معقولات کی جو کتابیں صدرا، قاضی، حمداللہ ان کے پاس تھیں، وہ اب آپ خارجی اوقات میں بحیثیت معین مدرس پڑھائیں گے۔ اور اسکی مناسب تنخواہ بھی مقرر ہوگی۔ اور اگلے سال جب آپ دورۂ حدیث سے فراغت پاسکیں تو یہ کتابیں مستقل آپ کے سپرد ہوں گی۔ اور آپ بحیثیت نائب صدر مستقل مدرس ہوسکیں گے۔ اراکین مدرسہ کی شوریٰ بھی طلب فرمائی جنہوں نے اس مشورہ کی منظوری دی۔ اور میرے لئے چارپائی، بستر، وغیرہ اور کچھ ماہانہ وظیفہ مقرر کیا گیا۔ اگلے سال حضرت امروہی مرحوم سے دورۂ حدیث شروع کیا۔

مولانا امروہی مسلک کی تلاش میں آپ نے وقت اور حالات کے مطابق دو ایک باتیں یہ فرمائیں کہ میں نے دورۂ حدیث تین مرتبہ کیا۔ پہلی بار عدم واقفیت کی وجہ سے ایسے استاد سے کتابیں پڑھیں کہ وہ غیر مقلد تھے۔ (ان کے نام کا تعین آپ نے نہیں کیا) دورہ شروع ہونے کے بعد اثناء درس میں اور بعد اختتام دورہ مجھ میں عدم تقلید کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ لہٰذا میں نے ارادہ کیا کہ ثانیاً دورۂ

حدیث اس خیال سے کروں کہ حق حقیق مجھ پر واضح ہو سکے۔ اس بنار پر میں حضرت قطب الارشاد مولانا گنگوھیؒ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اور جب ان کے درس میں شریک ہو گیا تو جس مقام پر میرا شک اور تردد ہوتا حضرت گنگوھیؒ فراستِ ایمانی کی روشنی سے میری طرف متوجہ ہو جاتے۔ اور ایسی تحقیق فرما لیتے کہ مجھے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مذہب و مسلک حق ہونے کا یقین حاصل ہو جاتا۔

حضرت گنگوھیؒ کا درسِ حدیث | حضرت گنگوھیؒ کی یہ خصوصیت تھی کہ اختلافی مباحث میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کا مذہب اقصیٰ مراتب کمال میں واضح کر دیتے اس طرح کہ کسی قسم کا شک و شبہ مذہبِ امام کی حقانیت میں نہ رہ سکتا۔ یہ احادیث میں ہمیشہ آپ کی عادتِ شریفہ رہی کہ اختلافی مسائل میں پہلے مذاہبِ اربعہ بیان کر لیتے۔ پھر امام ابوحنیفہؒ کی طرف سے جوابات دیتے اور اثباتِ مذہب حنیفہ کیلئے احادیث بیان فرماتے اور مخالفین کی احادیث کے امام کی طرف سے جواب دیتے۔

تو ایک مرتبہ کسی شاگرد نے عرض کیا کہ حضرت اگر امام شافعیؒ زندہ ہوتے اور آپ کی تحقیقات سے واقف ہو جاتے تو وہ بھی حنفی ہو جاتے۔ اس بات کا حضرت گنگوھیؒ پر اتنا بڑا اثر ہوا کہ رنگ زرد ہو گیا، اور بے ہوش ہو گئے۔ ہوش میں آنے پر اس طالب علم کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ ارے گستاخ اگر حضرت امام شافعی زندہ ہوتے تو رشید احمد تمہیں اسباق پڑھاتے یا حضرت امام شافعیؒ کی کفش برداری میں لگے رہتے۔؟

الغرض جب میں نے گنگوہ میں دورہ ختم کیا تو علاوہ دو تین مقامات کے میرے سارے شکوک رفع ہو گئے۔ اور میں امروہہ چلا آیا۔ یہاں حضرت مولانا احمد حسن امروہی کی خدمت میں حاضر ہوا تو عرض کیا، کہ حضرت میرے تمام شکوک حضرت گنگوھیؒ کے درس میں رفع ہو گئے ہیں۔ سوائے دو تین مقامات کے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ آپ میرے دورۂ حدیث کے اسباق میں بیٹھا کریں۔ بلکہ پورا دورہ یہاں بھی پڑھ لیں۔ تو جب میں نے تیسری بار یہاں حضرت مولانا احمد حسن امروہی سے بھی دورۂ حدیث پڑھا تو مذہب امام ابوحنیفہؒ مجھ پر بمنزلۂ موجود عینی کے منکشف ہو گیا۔

مولانا محمد قاسم کی کرامت | تیسری بات یہ ہے کہ ایک دفعہ درس میں طلبہ نے حضرت والاشان سے اس تعجب کا اظہار کیا کہ آپ کا جسم اتنا بھاری ہے، کثیر الجسامۃ ہیں۔ مگر رفتار میں پھر بھی اتنے تیز کہ ہم آپ کی عام رفتار کو دوڑنے میں بھی نہیں پہنچ سکتے۔ تو انہوں نے اس کی وجہ بیان فرمائی کہ جب میں نے دیوبند میں حضرت نانوتویؒ مرحوم سے خصوصی سفارشات کی وجہ سے مستقل طور پر جلالین شریف پڑھنا شروع کی اور اعلیٰ درجہ کے مدرسین بھی اس میں سامع ہوتے۔ مجھے اس زمانہ میں چلنے میں بھی بڑی دقت ہوتی۔

تو تنہائی میں ایک بار حضرت کی خدمت میں دعا کی درخواست پیش کی کہ موٹاپے کی وجہ سے چلنے پھرنے میں بڑی تکلیف ہے۔ میرے لئے دعا فرمائیں کہ یہ تکلیف سرعت رفتار سے بدل جائے۔ تو حضرت نانوتوی نے اس وقت سکوت فرمایا۔ مگر تہجد کے بعد میں اپنے حجرہ میں جلالین شریف کا مطالعہ کر رہا تھا کہ کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا باہر نکلا تو حضرت نانوتوی تشریف لائے تھے۔ فرمایا کہ دروازہ بند کر دو میں نے تعمیل حکم کی، اور حضرت میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر چل پڑے اور کسی آیت کی تحقیق سے متعلق بات چھیڑ دی۔ کہ اس میں آپ کو کچھ معلومات ہیں۔؟ تو میں نے عرض کیا کہ حضرت ہی اسکی تحقیق فرمادیں --- تو ہم راستہ میں چل رہے تھے۔ اور حضرت نے آیت کی تحقیق شروع فرمائی۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں آبادی تھی، اور تھوڑی دیر رکے تھے کہ پیران کلیر کے خادم مزار حاضر ہوئے، مزار کا دروازہ کھولدیا۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہا، حضرت نانوتوی حجرہ میں داخل ہوئے اور قبر کے پاس کچھ دیر مراقبہ فرمایا پھر باہر تشریف لائے اور میرا ہاتھ اسی طرح اپنے ہاتھ میں لیکر چل پڑے اور جہاں آیت کی تحقیق چھوڑی تھی وہاں سے آگے بات شروع فرمائی کچھ دیر گذری تھی اور تھوڑا سا عرصہ گذرا تھا کہ ہم دیوبند کے اپنے حجرے میں پہنچ گئے۔ جبکہ مدرسہ سے پیران کلیر کا مزار تقریباً چار پانچ میل یا اس سے زیادہ تھا ہمارا وہاں آنا جانا، مراقبہ کرنا سب کچھ تقریباً ۱۵ منٹ میں ہوا۔ جب ہم حجرہ میں پہنچے تو صبح قریب تھی، میں کمرہ میں داخل ہوا، اور حضرت تشریف لے گئے۔ صبح ہوئی تو میں نماز کے لئے چل پڑا، تو جسم میں نہایت خفت، پھرتی اور رفتار میں نہایت سرعت تھی۔ یہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی اس کرامت کا اثر تھا کہ عظمت جسامت کے باوجود میں اتنا سریع رفتار والا ہوں ---- الغرض میں نے حضرت کے سرعۃ المسافۃ کی کرامت کے علاوہ اور بھی حضرت کی کرامات کا مشاہدہ کیا۔

مارتونگ جانے کے اسباب ۱۳۳۶ھ کے آغاز میں میں نے دورہ احادیث شروع کیا، تو اسی سال میرے چچا دہلی سے ہری پور ضلع ہزارہ تشریف لے گئے، اور ہری پور کے قریب موضع کلابٹ میں مقیم ہو گئے۔ چونکہ وہ ایک متبحر ذکی عالم تھے۔ اس لئے بڑی کثرت سے ہزارہ اور چھچھ کے مختلف طلبہ جمع ہو کر مختلف کتابیں علوم وفنون کی آپ سے پڑھنا شروع کیں۔ انہی ایام کے لگ بھگ ہمارے گاؤں مارتونگ کے ایک قاضی صاحب جو ایک بہترین عالم تھے وفات پا گئے۔ قوم کی خواہش تھی کہ ان کی جگہ ایک ایسے جامع مکمل عالم آجائیں۔ جو مختلف فنون کے طلبہ کو بھی اپنے اردگرد اکٹھا کر سکے اور ساتھ ہی متقی اور منصف مزاج بھی ہوں کہ قومی جھگڑوں کا فیصلہ عدل والنصاف سے کر سکے۔ لوگ اس کوشش میں تھے کہ میرے استاذ حضرت مولانا علیق اللہ صاحب جو بلیانی کے باشندے تھے اور میرے چچا صاحب کے ہم عمر اور مخلص دوست بھی

تھے۔ انہیں میرے چچا کے بارہ میں پتہ چل گیا کہ وہ ہندوستان سے آکر کلابٹ میں طلبہ کو درس دے رہے ہیں۔ لہذا مولوی عتیق اللہ صاحب نے مارتونگ جاکر وہاں کے عوام کو جمع کیا۔ اور کہا کہ آپ کے حسب خواہش عالم مجھے معلوم ہے۔ جو ایک جامع متبحر منصف عادل عالم شخص ہے۔ اور ان کا ایک بھتیجا بھی امروہہ سے اس سال فارغ التحصیل ہونے والا ہے۔ تو مارتونگ کے لوگوں کے برگہ نے انہیں باصرار کہا کہ خدا کے لئے اس عالم کو کلابٹ سے لے آئیں، تو مولانا عتیق اللہ صاحب کلابٹ گئے اور میرے چچا کو مارتونگ لے جانے پر مجبور کیا ان کی آمد پر مارتونگ کے لوگوں نے اتفاق کیا کہ آپ ہی ہمارے پیش امام مدرس اور قاضی ہیں میرے چچا نے میرا ذکر کیا کہ وہ شعبان میں فارغ ہوکر آئیں تو میں ان کے متعلق بھی آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ انہیں یہاں دینی خدمات کے لئے رکھوں گا۔ اس کے بعد میرے عم محترم نے لگاتار کئی خطوط امروہہ بھیجے اور لکھا کہ امتحان اور فراغت کے بعد فوراً مارتونگ آجائیں۔

مولانا امروہی سے وعدہ تدریس | ۱۳۳۶ھ کے آخر میں میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوا۔ اور حضرۃ مولانا عبدالرحمان امروہی سے اجازت طلب کی کہ میرے چچا نے مجھے فوری طور پر طلب کیا ہے۔ اور میرے لئے ان کے مشورہ اور حکم سے تخلف کرنا مشکل ہے، لہذا مجھے جانے کی اجازت عطا فرمادیں تو انہوں نے اس شرط سے اجازت مشروط کردی کہ آپ آئندہ سال بھی تعطیل کے بعد بحیثیت نائب صدر کے تدریس کے لئے یہاں آئیں گے۔ میں نے وعدہ کیا، تو انہوں نے وعدہ کی توثیق کی غرض سے مہتمم مدرسہ کو فرمایا کہ ان کا سامان بستر وغیرہ دفتر ہی میں رکھ دو۔ اور اس کو طلبہ کے امدادی فنڈ، صدقات سے آنے جانے کا کرایہ اور خرچہ دیدو، مدرسین کی مد سے اس لئے نہ دو کہ بالفرض اگر مجبوراً نہ آسکیں تو ذمہ دار اور گنہگار نہ ہوں گے۔ تو میں مولانا صاحب کی اجازت سے رخصت ہوکر مارتونگ چلا آیا۔ اپنے چچا سے مولانا صاحب کے ساتھ کئے گئے وعدہ کا ذکر ہوا، انہیں پریشانی ہوئی کہ اب یہ دوبارہ جائیں گے ان ہی دنوں مولانا عتیق اللہ صاحب بھی مارتونگ میں موجود تھے، تو میرے رکوانے کے لئے ان میں یہ تجویز طے ہوئی کہ ان کا عقد نکاح کرایا جائے۔

عقد نکاح اور تدریس | چنانچہ اس تجویز کو زیر عمل لایا گیا، تو مجبوراً مجھے مارتونگ میں ٹھہرنا پڑگیا، تو تدریس شروع کی۔ میں اواخر شعبان ۱۳۳۶ھ میں یہاں آیا تھا۔ رمضان المبارک شروع ہوا اور میرے عم محترم کے ہاں مختلف فنون شروع تھے، تو انہوں نے بعض طلبہ میرے سپرد کئے۔ اسباق شروع کراتے ہی طلبہ مجھ سے نہایت مطمئن ہوئے تو طلبہ کی خوشی کی وجہ سے میرے چچا نے اکثر کتابیں میرے حوالہ کردیں۔ اور دو تین کتابیں اپنے پاس رہنے دیں۔ دو تین سال ہی میں فنون کے اعلیٰ درجہ کی کتابوں میں

نہایت شہرت، ہوئی اور اطراف واکناف سے کثرت کے ساتھ طلبہ کا ہجوم ہوا اور مجبوراً مجھے درس کو منظم اور باضابطہ شکل دینی پڑی۔ اس طرح کہ میں سات آٹھ اسباق اپنے ذمہ لے لیتا۔ اور طلبہ اپنی مناسبت سے ان کتب مشروعہ میں شامل ہو جاتے۔

حضرت سنڈاکی بابا سے بیعت وسلوک کا تعلق

اس اثنار میں کہ میں مارتونگ میں مقیم تھا کہ حضرت شیخ المشائخ قطب الارشاد مولانا مولوی ولی احمد صاحب المعروف بہ سنڈاکی باباؒ لوگوں کے رشد و ہدایا اور قومی رسم ورواج کی اصلاح کی غرض سے سوات تشریف لائے اور سوات کے علاقہ "شامیزو" میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ حضرت مولانا نجم الدین صاحب معروف بہ اڈے بابا صاحب کے خلیفہ مجاز تھے اور مولانا نجم الدین صاحب حضرت شیخ المشائخ مولانا عبدالغفور صاحب معروف بہ سوات بابا جی صاحب مرحوم کے خلیفہ تھے۔

چونکہ حضرت "سنڈاکی بابا" کی اصلاحات اور دفع مظالم کے واقعات حد شہرت کو پہنچ گئے۔ اور کرامات کا غلغلہ ہوا، تو میرے قلب میں جذبۂ محبت موجزن ہوا۔ اور آپ سے بیعت کے لئے فرط اشتیاق پیدا ہوا تو اپنے چچا صاحب کی اجازت سوات کے علاقہ شامیزو چلا گیا کہ حضرت کی ملاقات سے مشرف ہو جاؤں، اُن کے ساتھ میرا تعارف پہلے سے بھی تھا۔ وہ اس طرح کہ آپ جزیرۃ العرب سے واپسی کے دوران دہلی تشریف لائے تھے۔ اور دہلی کے عوام میں عموماً اور طلباء و علمار کے حلقوں میں خصوصاً ان کا چرچا ہوا۔ تین چار بعض وجوہات سے آپ دہلی تشریف فرما رہے۔ اس وقت میری جوانی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ مگر میں نے بعض اوراد کی اجازت ان سے لے لی تھی اور اس کا اتنا اثر تھا کہ چار پانچ ماہ تک میں مدرسہ فتح پوری سے دہلی کے بازار تک نہیں گیا۔

اس کے بعد دہلی سے حضرت سنڈاکی باباؒ پشاور تشریف لائے اور تہکال پایاں میں مقیم ہوئے اور لوگوں سے مشورہ کیا کہ یہاں ایک ایسی درسگاہ قائم کی جائے جو ہندوستان کے دیوبند کی طرز پر ہو، مدرسہ کی عمارت کی تعمیر شروع فرمائی، مگر عمارتی چوب اور دیگر ضروریات کی غرض سے سوات تشریف لائے اور علاقہ شامیزہ میں ٹھہر گئے، یہاں چونکہ نواب دیر کی حکومت تھی اور حکومت کے کارندوں کے مظالم پٹھانوں کے غرباء پر حد سے زیادہ ہو گئے تھے، اور پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا۔ آپ یہاں کی اصلاح اور نواب دیر کی حکومت ختم کرانے کے خیال سے یہیں مقیم ہو گئے، اور دارالعلوم تہکال کے بنانے کی تجویز ادھوری رہ گئی۔

(باقی آئندہ)

محمد سعید الرحمٰن علوی
جامع مسجد حضرو

قادیانیت کے خلاف مسلسل جدوجہد انکی زندگی کا مشن تھا

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

دن گذرتے دیر نہیں لگتی۔ ۲۱ر اپریل ۱۹۷۱ء کی صبح تک جو سراپا خلوص و محبت انسان دفتر مجلس تحفظ ختم نبوت میں بیٹھا اپنے ناخن تدبیر سے لاینحل مسائل حل کر رہا تھا۔ اور علم و سیاست پر علوم و معارف کے دریا بہا رہا تھا، اگلے ہی دن مدرسہ خیر المدارس ملتان کے احاطہ میں اپنے استاذ و مربی حضرت مولانا خیر محمد صاحب رح کے پہلو میں ابدی نیند سو گیا اور لاکھوں وابستگان کو غم و اندوہ سے نڈھال کر گیا۔ آنکھ جھپکنے کی دیر ہی تو ہوتی ہے۔ لیکن اس واقعہ کو ایک سال بیت گیا۔ اس ہستی کا نام محمد علی تھا۔ وضع قطع کے اعتبار سے پنجاب کے ٹھیٹ دیہاتیوں میں اور اس میں قطعاً کوئی فرق نہ تھا۔ لیکن قدرت نے فہم و دانش اور تدبر سے اسے حصہ وافر عطا فرمایا تھا۔ اسے اقلیم خطابت کا شہنشاہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ مرحوم نے مدرسہ خیر المدارس جالندھر میں علوم و فنون کے معتد بہ حصہ پر عبور حاصل کیا۔ بعد ازاں مادر علمی دارالعلوم دیوبند کی راہ لی۔ ان دنوں دارالعلوم دیوبند کی مسند صدارت پر حضرت العلامہ محدث اکبر الشیخ محمد انور شاہ کاشمیری جلوہ افروز تھے —— وہ انور شاہ جنہیں حکیم الامت تھانوی حقانیت اسلام کی ایک نشانی قرار دیتے اور امیر شریعت بخاری مرحوم فرماتے:

"—— میاں، صحابہؓ کا قافلہ جا رہا تھا انور شاہ بچھڑ گئے۔"

محمد علی کے مقدر کا ستارہ چمکا اسے انور شاہ جیسا استاد ملا۔ اس نے شیخ اکبر کے حضور زانوئے تلمذ تہ کئے اور جب فارغ ہوا تو مادر علمی کی روایات کے مطابق خطیب و مدرس کے ساتھ مجاہد بھی تھا —— یہ طرۂ امتیاز اس درسگاہ کو حاصل تھا کہ یہاں کے مفتی، مدرس، خطیب، محدث، مفسر، مجاہد بھی ہوتے تھے۔ انہی مجاہدین نے انگریزی سامراج کو للکارا اور اسے ناک چنے چبوائے —— فراغت کے بعد مدرسہ خیر المدارس

میں چندے قیام کیا اور تدریس کا مشغلہ اپنا لیا۔ مصدقہ روایات سے علم ہوا کہ آپ بلا کے مدرس تھے اور قدرت نے افہام و تفہیم کا وہ ملکہ عطا فرمایا تھا کہ غبی سے غبی طالب علم بھی مطمئن ہو جاتا ——— بعد ازاں برصغیر کے کفن بردوش مخلص و ایثار پیشہ کارکنوں کی جماعت مجلس احرار اسلام میں شمولیت اختیار فرمائی۔ مجلس میں شمولیت کے دو مقصد تھے۔

۱۔ انگریزی راج کے خلاف جدوجہد جس کا سبق مادرِ علمی دیوبند سے حاصل کیا تھا۔

۲۔ انگریز کے خود کاشتہ پودے "قادیانیت" کے خلاف جہاد۔

یہ فرقہ انگریز کے اشارہ ابرو پر ملتِ مرحومہ کے متاع ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کی منظم کوشش کر رہا تھا۔ اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے امت کی وابستگی کو ختم کر کے گوری چمڑی والے صاحب بہادر سے جوڑنا چاہتا تھا ——— اس فرقہ ضالہ مرتدہ کی پوری تحریک کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ انگریزی راج کو رحمتِ الٰہی ثابت کیا جائے۔ اور نبوتِ کاذبہ کی وساطت سے "شرعی سند" مہیا کی جائے۔

حضرت العلامہ انور شاہ کشمیری کے زمانہ میں اس طبقہ کی سرگرمیاں عروج پر تھیں، اس لئے شاہ صاحب مرحوم اسطرف خاص توجہ فرماتے تھے۔ آپ نے زندگی کے آخری ایام میں بہاولپور کے مشہور مقدمہ میں وکیل اسلام کی حیثیت سے اس فتنہ پر کاری ضرب لگائی، اور واپسی پر فرمایا: "زندگی تیزی سے گذر رہی ہے، میری موت کے بعد فیصلہ ہو تو میری قبر پر آکر سنا دینا" چنانچہ بہاولپور کے محکمہ امور شرعیہ کے سربراہ مفتی محمد صادق صاحب مرحوم نے دیوبند جا کر قبر انور پر فیصلہ سنایا۔

حضرت شاہ صاحب کی عقابی نگاہیں اس فتنہ کو پوری طرح دیکھ رہی تھیں یہی وجہ ہے کہ حیاتِ مستعار کے بالکل آخری لمحات میں وابستگان و متوسلین کو جمع کر کے فرمایا:

"محمد عربی کی شفاعت چاہتے ہو تو آپ کی امت کو فتنۂ ارتداد (قادیانیت) سے بچاؤ"

مرحوم محمد علی کے ذہن میں استادِ گرامی کی نصیحت موجود تھی۔ اسی لئے آپ نے مجلس احرار اسلام کا انتخاب فرمایا تاکہ منظم طریق سے اس فتنہ کے خلاف کام کیا جا سکے ——— آپ نے جماعت کے شعبۂ تبلیغ کو اپنی انتظامی صلاحیتوں اور خطیبانہ عظمتوں سے چار چاند لگا دئیے ——— قدرت نے آپ کو فنِ تقریر میں وہ ملکہ عطا فرمایا تھا کہ باید و شاید ——— ؟ ایشیا کے معمر عوامی خطیب حضرت امیر شریعت قدس سرہٗ نے بھی متعدد مواقع پر آپ کے سامنے سپر ڈال دی اور آپ کے بعد تقریر کرنے سے انکار فرما دیا۔

عوام کی زبان میں گفتگو کرنا اور مثالوں سے انہیں سمجھانا محمد علی کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بلاشبہ آپ منفرد مقام کے حامل تھے۔ مولانا مرحوم خلق محمدی کا بہترین نمونہ تھے۔ تواضع، انکساری، اولوالعزمی، ایثار اور

ایفائے عہد جیسی صفات میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کی زندگی کے ایک ایک پہلو پر تفصیل سے کلام کرنا آسان بات نہیں۔ صرف اس موقعہ پر ایفاء عہد کے ضمن میں ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیں :

۱۹۴۲ء میں اکابرین مجلس کے حکم دایما پر مسجد سراجاں ملتان میں خطبہ جمعہ کی ذمہ داری سنبھالی تادم مرگ اس ذمہ داری کو نبھایا، جیل جیسی شرعی اعذار کے علاوہ ناغہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ طویل ترین اسفار کے بعد جمعہ کو ہر حال میں ملتان میں حاضری دی۔ حتیٰ کہ جب ۱۹۵۳ء میں خداوندانِ پاکستان نے مسجد سراجاں میں خطبہ جمعہ پر پابندی لگا دی، تو قریب ہی مسجد خونی برج میں خطبہ شروع کر دیا۔ تقریباً ۲۰ برس تک ایک ہی مقام پر خطابت کی ذمہ داریاں نبھانا اور وہ بھی ایسے حال میں کہ ملک بھر میں تبلیغی اسفار درپیش تھے، معمولی بات نہیں، لیکن محمد علی مرحوم نے ایسا کر دکھایا۔

تقسیم ملک کے بعد حضرت امیر شریعت نے مجلس احرار اسلام سے وابستہ ساتھیوں پر واضح کر دیا کہ وہ آئندہ سیاسی کام نہیں کریں گے، بلکہ محض فرائض تبلیغ سرانجام دیں گے۔ اس مقصد کی خاطر آپ نے احباب کے مشورہ سے جماعت کو تقسیم کیا، سیاسی کام کا شوق رکھنے والے حضرات مثلاً شیخ حسام الدین ماسٹر تاج الدین رحمہما اللہ نے احرار کو سنبھالا اور شاہ جی نے مجلس تحفظ ختم نبوت کی نیو اٹھائی۔

شاہ جی نے خود محمد علی کو اپنا ساتھی بنایا دوسرے فریق نے بہت کوشش کی کہ محمد علی انہیں مل جائے لیکن شاہ جی نے فرمایا اس کو تمہیں دے کر اپنے پاس کیا رکھوں گا۔ ؟

امیر شریعت کو مرحوم پر پورا پورا اعتماد تھا، اس لئے انہوں نے آپ کو چھوڑنا گوارا نہیں کیا اور خلوت و جلوت میں اپنا ہم جلیس و رفیق بنایا۔ حضرت میاں اصغر حسین صاحب نے حیات شیخ الہند میں لکھا ہے کہ مولانا مدنی کو شیخ الہند سے وہی نسبت ہے جو رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم سے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ہے۔ اسی طرح یہ دعویٰ غلط نہیں ہوگا کہ جو نسبت صدیق و محمد کے درمیان ہے وہی نسبت امیر شریعت اور محمد علی کے درمیان ہے۔ دونوں بزرگوں کی کتاب زندگی کے اوراق ساری دنیا کے سامنے موجود ہیں انہیں ملاحظہ فرمانے کے بعد فیصلہ آسان ہے۔ مجلس کے قیام کے بعد آپ کی تمام تر سرگرمیاں "مرزائیت" کے استیصال کیلئے وقف تھیں مشہور عالم تحریک ۱۹۵۳ء کی کامیابی کا سہرا امیر شریعت کی قیادت کے ساتھ ساتھ محمد علی کے خلوص و تدبر کے سر ہے، مرحوم نے جس تندہی سے کام کیا۔ تحریک کو منظم کیا اور تمام مکاتب فکر کے رہنماؤں کو ایک سٹیج پر اکٹھا کیا، وہ انہی کا حصہ تھا۔

واقفان حال اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اس تحریک کے صدقہ ملک مرزائیت کی دستبرد سے بچ گیا، ورنہ آنجہانی مرزا محمود ۱۹۵۲ء کی دھمکی دے چکے تھے، اسی پر امیر شریعت نے فرمایا تھا ۱۹۵۲ء آپ کا

ہے تو ۱۹۵۳ء ہمارا ــــ مرحوم محمد علی کو "اندر کے ذمہ دار لوگوں" نے بتایا کہ تحریک کی ابتدائی مرحلوں میں ہم لوگ آپ کو جی بھر کر گالیاں دیتے تھے کہ ملک کو تباہ کر رہے ہیں۔ لیکن بعد میں جب حقائق سامنے آئے، تو بے ساختہ منہ سے دعائیں نکلتی ہیں کہ تحریک کے صدقہ ملک بچ گیا، ملک کی تاریخ میں کتنے ہی موڑ آئے جب مرزائیت نے ملک پر مسلط ہونے کی مکروہ کوشش کی لیکن مرحوم محمد علی اور اس کے ساتھیوں نے انکی ہر سازش کو ناکام بنا دیا ــــ آپ کی اس ضمن میں خدمات کا سرسری تذکرہ ملاحظہ فرمائیں، کچھ تفصیلات آپ کو مرزائیوں کے سیاسی کردار نامی کتابچہ سے معلوم ہوں گی جو سرگودھا کی مجلس تحفظ ختم نبوت نے طبع کرایا ہے۔

۱۔ ریڈ کلف کمیشن کے دوران سر ظفر اللہ نے ملک کو نقصان پہنچایا، قاضی احسان احمد مرحوم سمیت مرحوم محمد علی نے ارباب اختیار کو توجہ دلائی، لیکن افسوس کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی، نتیجہ ظاہر ہے۔

۲۔ بلوچستان کو مرزائی صوبہ بنانے کی سازش ہوئی تو یہی بزرگ بے ساختہ آتش نمرود میں کود پڑے اور مرزائیوں کو منہ کی کھانی پڑی۔

۳۔ راولپنڈی سازش کیس میں ارباب اختیار کو چھپے ہوئے ہاتھوں کیطرف توجہ دلائی۔

۴۔ انگریز C.N.C کیطرف سے قادیانی C.N.C نامزد کرنے کی سازش کو ناکام بنایا۔

۵۔ فرقان بٹالین (مرزائی) کی سرگرمیوں سے پردہ اٹھا کر اسے ختم کرایا۔

الغرض ملک وملت نے جہاں پکارا وہی ان بزرگوں نے قربانی دی۔

آخر میں ایوب و یحییٰ نے آمریت نے نشہ میں بدمست ہو کر جب کسی کی نہ مانی تو قدرت کیطرف سے جو سزا ملی وہ سامنے ہے۔ مرحوم محمد علی مجلس کے تیسرے امیر تھے اور یہ شرف آپ کو ہی حاصل ہے کہ آپ کے دور میں مجلس کا اپنا دفتر تعمیر ہوا۔ اور شاہ جی کی خواہشات کے پیش نظر سات سمندر پار یورپ میں (قادیانیوں کے آقایان ولی نعمت کے دیس میں) میں موجودہ امیر مولانا لعل حسین اختر نے تین سال تک قیام فرما کر کئی ایک معرکوں میں قادیانیت کو شکست فاش دی۔ (انکی تفصیلات سفر نامہ مولانا لعل حسین اختر کے ذریعہ معلوم ہوں گی جو عنقریب چھپ کر مارکیٹ میں آرہا ہے۔) مرحوم محمد علی ابھی اور بہت کچھ کرنا چاہتے تھے لیکن موت کے بے رحم ہاتھوں نے انہیں آ دبوچا اور وہ کتنے ارمان اور حسرتیں دل میں لیکر راہی ملک بقا ہو گئے ــــ لیکن آپ نے خون جگر سے جس مشعل کو فروزاں کیا تھا، اس کی روشنی میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ اور یہ انہی بزرگوں کی کاوشوں کا ثمرہ ہے کہ آج ہر طرف سے "قادیانیت" کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب محمد عربی کی ناموس کے دشمنوں کو ملک میں ان کا "جائز مقام" ملے گا، اور اسطرح ہزاروں شہداء ختم نبوت سمیت ان بزرگوں کی بے قرار روحیں طمانیت وسکون حاصل کریں گی۔ لیکن اس کیلئے یہ ضروری ہے کہ اس مشن کو زندہ و تابندہ رکھا جائے۔ اسی ضرورت کے پیش نظر یہ سطور قلم بند کی گئیں اللہ تعالیٰ شرف قبولیت سے نوازے۔

حاجی بشیر احمد صاحب

جناب حاجی حکیم بشیر احمد صاحب سکنہ سہارن خورد ضلع گوجرانوالہ کو ۱۹۵۷ء میں حج بیت اللہ کی سعادت نصیب ہوئی۔ انہوں نے دوران سفر جو تاثرات قلمبند فرمائے اس سے چند اقتباسات قارئین کی خدمت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ (ادارہ)

★

۱۵ مئی ۱۹۵۷ء بروز بدھ میں بغیر نشر و تشہیر کے چپ چاپ گھر سے روانہ ہوا۔ اور ۱۷ مئی ۱۹۵۷ء کو کراچی پہنچا۔ وہاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کافی دن گذارنے پڑے۔ جوں جوں دن گذرتے جاتے تھے امید کی گھڑیاں قریب تر ہوتی جاتی تھیں۔ مگر ساتھ ہی یہ خوف بھی تھا، کہ شاید اس دفعہ بھی قرعہ غلط ہی نکلے، اور خدا جانے کتنے یوم مزید کراچی کا آب و دانہ قسمت میں ہے —— آخر ۳۰ مئی کو رات کے قریباً دو بجے ہمیں کراچی سے بصرہ تک جہاز کے ٹکٹ مل گئے۔ دوسرے دن صبح سے بندرگاہ پہنچنے کی تیاری کر رہے تھے، جن کامیاب حضرات کو جہاز کے ٹکٹ مل چکے تھے، وہ اپنا اپنا رخت سفر باندھ رہے اور زبان حال سے خدائے قدوس کی حمد و ثنا کہہ رہے تھے اور جو ٹکٹ سے محروم تھے، وہ سراسیمہ و حیران و پریشان تھے۔ ان کو دوگونہ بیقراری تھی ——

قریباً گیارہ بجے ہم بندرگاہ پہنچے، وہاں ہمارے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ دیکھے گئے اور نبض سے بھی مقصد مطلوبہ حاصل کر کے محکمہ نے اپنی مہر بلا اجرت و بلا وقت ہمارے پاسپورٹ پر نصب کی۔ بعد ازاں ہم نے اپنا سامان شیڈ کے اندر لا کر رکھا، محکمہ کے افسران نے سارا سامان چیک کیا۔ اس دوران ہمیں بے حد پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد سامان کو جہاز میں پہنچانا اور پھر بآرام جگہ حاصل کرنا بجز بتائید ایزدی نیست —— بہرکیف ہم جہاز میں سوار ہو گئے۔ مگر جگہ بہت ہی ناکافی اور تکلیف دہ ملی، یعنی دروازے کے بالکل قریب

ہر خورد و کلاں کا گذر اور پھر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کیلئے آمدورفت نے یہاں ہمیں ایک گونہ روحانی اور جسمانی تکلیف دی، وہاں زبانِ طعن و تشنیع پر مہرِ خاموشی بھی ثبت کر دی۔ اور ہم دو آدمی تو بالکل مُوتو قبل اَن تموتو کے پیکرِ مجسمہ تھے، عورتوں اور مردوں کا بالکل ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہونا بعض طبائع پر ایک اور بھی قہر ڈھاتا تھا۔ یعنی ان کا نورِ ایمانی زنگِ شیطانی سے ملوّن ہونا بھی ممکن تھا۔ مگر قربان جاؤں قدرتِ خداوندی کے کہ لحظہ بھر میں سب اپنے اپنے کام میں مشغول ہوئے۔ اور غیر نظر سے دیکھا تو در کنار نظر خود ہی بند ہوگئی اور جہاز روانہ ہُوا ——

—— جہاز جا رہا تھا، سمندری لہریں اسے اپنے دامنِ آغوش میں لئے ہوئے فرطِ محبت سے دباتی اور چھوڑتی تھیں۔ مسافروں کو خوب ہچکولے آ رہے تھے —— یکم جون کو عین بارہ بجے دوپہر ہم گوادر بندرگاہ پہنچے اور دوسرے دن جہاز مسقط بندرگاہ پر کھڑا ہوگیا۔ اور شام کے پونے چھ بجے پھر یہاں سے روانہ ہُوا۔ اب جہاز ریل گاڑی کی طرح چل رہا تھا۔ بالکل ہچکولے کا نام و نشان نہ تھا۔ اور سفر پُر لطف تھا۔

دورانِ سفر ہمارا جہاز مختلف بندرگاہوں مثلاً دوبئی۔ بحرین۔ یو شائر سے ہوتا ہُوا کویت کے مقابل تین میل کے فاصلہ پر لنگر انداز ہوا، مال اترنا شروع ہوگیا۔ اور رات کے ½ ۹ تک جہاز کھڑا رہا۔ یہاں سے روانگی کے وقت بندرگاہ کا منظر نہایت قابلِ دید تھا۔ روشنی کے مینار مجسم روشنی بنے ہوئے تھے۔ جہاز یہاں سے کسی قدر واپس چل کر پھر اپنی اصلی راہ پر آگیا اور جانبِ منزل روانہ ہُوا۔

۸ جون کو پورے آٹھ بجے جہاز بصرہ بندرگاہ پہنچا۔ چیکنگ کیلئے پاسپورٹ ہم سے لئے گئے، اور پولیس کے اعلیٰ افسران عراقی جہاز کے کمرۂ سفارتی میں تشریف لے آئے۔ وہ تمام پاسپورٹ کے نمبر دیکھتے اور اپنی کتاب میں ان کا قانونی طور پر اندراج کر کے پاسپورٹ واپس کر دیتے —— جہاز سے باہر ہم قریباً دو گھنٹے ٹھہرے رہے۔ آخر ادارہ کا منتظم ایک ٹرک لایا۔ اس میں سامان لا کر خندق محمدی جو یہاں سے قریب ہی ہے، پہنچایا گیا۔ وہاں سامان کو ایک مخصوص مکان میں رکھا۔ ظہر کی نماز ادا کی۔ ہوٹل کا انتظام بہت اچھا تھا۔ کمرہ موزوں مل گیا۔ خوب آرام کیا۔ رات کو سوئے صبح ہوئی تو اللہ جل شانہ' کا شکر ادا کیا۔

—— رات ہی سے مولوی محمد اسحاق صاحب نے زیارات کا پروگرام مرتب کیا تھا۔ چنانچہ ۱۰ جون کو آٹھ بجے چار ٹیکسیوں پر ہمارا قافلہ روانہ ہُوا۔ قریباً ۹ بجے بستی زبیر کے قبرستان میں ایک مکان کے اندر حضرۃ خواجہ حسن بصریؒ کے مزارِ اقدس پر فاتحہ خوانی کی، ان کی پائینتی میں حضرت امام محمد بن سیرین کا مزار ہے۔ بستی زبیر جسکو پرانا بصرہ بھی کہا جاتا ہے میں ایک عالیشان مسجد کے اندر داخل ہوئے۔ اس کے کمرہ کے ایک گوشہ میں حضرت زبیرؓ کا مزار ہے —— اس بستی سے پھر ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر واپس ہوئے۔ راستے میں ایک

مینار نہایت شکستہ حالت میں سڑک کے کنارے پر واقع ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک کس مپرسی کی حالت میں برآمدہ ہے۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ شیرِ خدا رضی اللہ عنہ، نے یہاں تھوڑا سا قیام کیا تھا ــــــ

واپس ہوٹل میں پہنچ کر کھانا وغیرہ کھایا۔ اور دو بجے کے قریب پھر روانہ ہوئے۔ اپنا سامان لیکر بصرہ کے ریلوے اسٹیشن پر جو کہ ہمارے مقامِ رہائش سے تقریباً ۲ میل دور تھا پہنچے، یہاں سے بذریعہ ریل بغداد گئے۔ ریلوے اسٹیشن پر اتر کر بسوں کے ایک خوبصورت اڈا شرکۃ الباصات الوطنیہ پہنچے یہاں کی کوئی زیارت اور کوئی مقام نہ دیکھا۔ شام کی نماز کے بعد ہماری بس یہاں سے روانہ ہوئی۔ رات کے وقت دورانِ سفر کوئی خاص چیز دیکھنے میں نہ آئی۔ صبح ½۹ بجے کے قریب رطبہ چوکی پر پہنچے، لاری نے پٹرول لیا اور ہم نے پانی لیا۔ یہاں ہمارے پاسپورٹ بھی چیک کئے گئے ــــ یہاں تقریباً نصف راستہ ختم ہو جاتا ہے ــــ

قریباً ½۱ گھنٹہ قیام کے بعد لاری پھر چلی۔ اور عصر کے قریب عراقی آخری چوکی ایچ فور (H-4) پہنچی، جہاں ہم نے نمازِ عصر ادا کی۔ بعد ازاں جب شرق اردن کی سرحد آئی تو ایسا پتھریلا چٹیل میدان شروع ہوا جس طرح کوئی ہوائی اڈا وسیع پیمانے پر بنایا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھتے گئے ــــ آخر آفتاب اپنی جوانی کی بہار گذار کر کہولت کے چکر میں تھا۔ تو ایک ایسا منطقہ آیا جس میں سیاہ رنگ کے پتھروں کی جیسے بارش ہوئی تھی، بے قاعدگی سے پڑے ہوئے پتھریاں دکھائی دیتے تھے، جیسے یہاں سے کبھی کوئی بنی آدم گذرا ہی نہیں ــــ نمازِ مغرب اور پھر نمازِ عشاء لاری ہی میں پڑھی ــــ مگر اب سڑک ہموار آچکی تھی، اور سکون کا سفر تھا۔

چلتے چلتے ایک شہر آیا جو کافی بڑا تھا ــــ یہ عمان شہر تھا۔ مگر ہمیں ابھی تک مکمل طور پر یقین نہ ہونے کی وجہ سے اطمینان نہ ہوا۔ لاری ڈھلان کیطرف مائل ہوگئی۔ کچھ ڈھلان اتر کر ڈرائیور نے کسی قدر افسوس کے ساتھ سر ہلایا۔ اور لاری کھڑی کردی، میں نے تو خیال کیا کہ شاید راہ سے بھٹک گیا ہے۔ ہم میں سے بعض آدمیوں نے نمازِ تہجد ادا کی، تقریباً ۲ گھنٹے بعد لاری پھر چلی۔ تو بہت جلد ہی اپنے اڈا پر پہنچ گئی۔ ہم اتر کر اپنی رہائش گاہ پر پہنچے۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد اس طرح خوابِ خرگوش سوئے کہ جسطرح کوئی گھوڑے بیچ کر سوتا ہے ــــ

۱۵ر جون بروز ہفتہ صبح بس پر سوار ہو کر ہم قریباً ۶۵ آدمی زیارات کو روانہ ہوئے ــــ عمان سے چلتے ہی پہاڑی سلسلہ کوہ ہے۔ مگر یہ پہاڑ سرسبز پہاڑ ہیں۔ عمان سے ۳۰ کلومیٹر پر ایک شہر ہے، اس سے

چند میل آگے چل کر وادی حضرت شعیب علیہ السلام شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے گذر کر شونہ کی بستی ہے۔ اس سے آگے نہر الاردن ہے۔ جو علاقہ اردن اور فلسطین کی حدِ فاصل مانی جاتی ہے۔ اس سے آگے اریحا کی آبادی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ شہر فلسطین کے علاقہ میں اردن سے جاتے ہوئے پہلا پر رونق شہر ہے۔ اس سے آگے چل کر سڑک کے بائیں جانب تقریباً ۱½ میل کے فاصلہ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا روضۂ انور ہے۔ مزارِ مبارک تک سڑک پختہ جاتی ہے، مزارِ مبارک سرخ پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ اس جگہ سیاہ پتھر ہے جو معجزہ کے طور پر آگ لگانے سے جلتا ہے۔ لوگ یہاں آکر کچھ نیاز وغیرہ پکاتے ہیں۔ تو ایندھن کی جگہ کام دیتا ہے۔ مگر اس حد سے باہر یہ صفت فوت ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد ہم بیت المقدس پہنچے۔ اور بعد ازاں بیت لحم کا شہر دیکھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جائے پیدائش ہے۔ اس سے آگے باب الخضر، برق سلیمان علیہ السلام، بستی نخ خلیل، بستی غضر عاصیون، اور مقام الخلیل ہے، اس کا پرانا نام (کنعان) ہے۔ یہاں اتر کر الجزیرہ ہوٹل میں بستر ڈال دئے۔ ½ گھنٹہ آرام کے بعد شہر کے دوسرے کونہ پر مقامِ مبارک باسم گرامی "خلیل الرحمٰن" پہنچے ـــ سب سے پہلے جدّ انبیا علیہم السلام حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے مزارِ مبارک پر ہدیۂ دعا و سلام عرض کیا، اور فاتحہ شریف پڑھا ـــــــ اس کے بعد تمام مزاروں پر درود و سلام اور فاتحہ شریف پڑھا۔

بعد ازاں بستی العوزہ، ابو الغمرہ اور دورہ سے ہوتے ہوئے، مزارِ اقدس حضرت نوح علیہ السلام دیکھا۔ اور متعجب ہوا، کیونکہ یہ مزار نہایت بوسیدہ جگہ پر تھا، اس کے اوپر پیوند لگا ہوا ایک سبز رنگ کا غلاف تھا۔ کیونکہ سنا ہے کہ اگر دنیا کے سارے ولی قطب۔ غوث۔ ابدال کی شان اور مراتب من اللہ کو یکجا کیا جائے، تو ایک ادنیٰ صحابی کی شان کے برابر نہیں ہو سکتی، مگر ساڑھے نو سو برس اعلائے کلمۃ الحق کے پیغام بر اولو العزم اور آدم ثانی کے مزار تقدس آثار کا یہ عالم کہ ہمارے یہاں کے مزارات اس پر فوق الحیثیت ہوں گے۔ مگر نعوذ باللہ صرف عمارتی لحاظ سے، ورنہ نبی جہاں ہے نبی ہے، اس کی شان خدائے قدوس کو ہی معلوم ہے ـــــ

اس کے علاوہ بہت دن سفر میں گذرے اور کئی زیارتیں کیں۔ ۲ر جولائی ۱۹۵۷ء کو مدینہ منورہ پہنچ جانے کا ذوق و شوق نہایت سرعت سے گدگدی لے رہا تھا۔ ع

سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے۔

ہر لمحہ حضور کی محبت مردہ دلوں کو جگا رہی تھی، کہ اللہ کے فضل و کرم سے ۹½ بجے مدینہ منورہ کی بیرونی پولیس چوکی پر پہنچے۔ یہاں سامان بغرض تلاشی نیچے اتروانے کا حکم محکمہ کیطرف سے ہوا۔ جب اتروایا گیا تو بغیر

تلاشی کے بعد بھاگ کا نستان لگاکر اجازت مل گئی۔ اس حرکت سے ہم بھٹکے ہوئے آدمی ایک گونہ تو دل میں کڑھے مگر قہر درویش بر جانِ درویش۔ اور کچھ مدینہ کے ساکنین کے متعلق تو زبانِ شکوہ دراز کرنا کیسے درست ہو سکتا ہے۔ جبکہ ہم ہر وقت زبانِ حال سے یہ شعر پڑھتے ہوں ؎

قدم کیوں نہ اہلِ مدینہ کے چوموں
جوارِ نبی کے ہیں یہ رہنے والے

——— ہماری بس مدینہ منوّرہ کی جانب جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مدینہ منوّرہ کے در و دیوار اور اس مقدس شہر کے بعض حصص نظر آنے سے دلوں میں ایک نئی امنگ اور نیا شوق ظہور پذیر تھا۔ درود شریف پڑھتے پڑھتے اس وادئ مقدسہ میں داخل ہوئے تو دل نے کہا ؎

یہاں جرأتِ شوق سوئے ادب ہے
نگاہوں کو غافل ادب سے جھکالے

بن آئی ہے لے طبع مشتاق تیری
جہانِ تجلی سے دل کو بسالے

اسے کیا ہوس کائناتِ جہاں کی
جو اس زندگی ہی میں جنت کو پالے

مدینہ کے کوچے ہیں اور ہیں جنت
بلا سے جو پڑ جائیں تلووں میں چھالے

غلاموں کے آقا غریبوں کے مونس
مجھے بھی گدا اپنے در کا بنالے

کروں کس زبان سے ادا شکر تیرا
حریم رسالت میں پہنچانے والے

سیہ کار ہوں اور یہ آسرا ہے
کہ دامانِ رحمت میں کوئی چھپالے

■■

جائزہ مدارس عربیہ مغربی پاکستان (دوسرا ایڈیشن) مرتبہ حافظ نذر احمد صاحب، صفحات ۷۲۰،
قیمت ۱۸ روپے۔ پتہ مسلم اکاڈمی ۲۹/۱۸ محمد نگر علامہ اقبال روڈ، لاہور۔

اسلامی ہند کے مسلمانوں کی تعلیم و ثقافت کی حفاظت و ترویج میں مدارسِ عربیہ کا بنیادی حصہ ہے بحمد اللہ علماء کرام کے مساعی اور دردمند مسلمانوں کے تعاون سے پاکستان کے اکثر چھوٹے بڑے دیہات اور شہروں میں مختلف مکاتب فکر کے مدارس کا ایک وسیع جال پھیلا ہوا ہے جہاں سے علوم اسلامیہ کی روشنی پھوٹ پھوٹ کر ہزاروں لاکھوں کے دل و دماغ کو ایمان و عرفان سے منوّر کر رہی ہے۔ ان مدارس کا تعمیرِ ملّت میں اہم ترین مقام ہونے کے باوجود ان کے احوال و کوائف اور مجموعی تعداد سے عوام تو کجا خواص بھی پورے واقف نہیں تھے۔ ان مدارس کا باہمی تعارف اور مربوط ہونا تو دور کی بات تھی، جناب حافظ نذر احمد صاحب ایم اے جنہیں خدا نے تعلیمی مسائل سے خاص دلچسپی عطا کی ہے، کو حق تعالیٰ نے اس کام کی توفیق دی، انہوں نے دس بارہ سال قبل ایسے مدارس کا جائزہ لیا اور ۶۷۱ مدارس کی فہرست اور ۳۹۲ مدارس کے کوائف کتاب کے پہلے ایڈیشن میں جمع فرمائے، علمی حلقوں میں اس کاوش کا زبردست خیر مقدم ہوا، مگر نقش ثانی کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ جناب حافظ صاحب نے دوبارہ ایک جامع منصوبہ تیار کیا، ہزاروں خطوط، سوالناموں، اسفار اور مختلف وسائل کے ذریعہ مدارس کا کھوج لگایا اور زیرِ نظر ایڈیشن میں ۸۹۳ مدارس کی فہرست اور ۵۶۳ مدارس کے کوائف جمع کئے ـــــ احوال و کوائف میں ان مدارس کی مطبوعہ رپورٹوں اور فراہم کردہ مواد پر اعتماد کیا گیا ہے۔ حافظ صاحب نے اربابِ مدارس سے اپیل کی تھی کہ وہ اس بارہ میں نہ تو کسر نفسی اور اخفاء سے کام لیں، نہ مبالغہ آرائی سے اب اگر بعض رپورٹوں میں یہ چیزیں محسوس ہوں تو مؤلف اس سے بری الذمہ ہیں۔ حافظ صاحب سے جو کچھ ہو سکا اس عظیم اور وسیع کام کی شکل میں مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا۔ اور پورے حلقۂ مدارس سے فرض کفایہ ادا کر دیا۔ فجزاھم اللہ

عن سائر اهل العلم والمسلمین۔

فاضل مؤلف نے کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کر کے پہلے چار ابواب میں صوبہ وار مدارس کے حالات جمع کئے بقیہ ابواب میں درسِ نظامی، قدیم نصاب میں اصلاح، طرزِ تعلیم، نظامِ تعلیم، دینی مدارس اور دینی تعلیم نظم ونسق، دار الکتب، مجلات، تعلیم نسواں وغیرہ ابواب میں کئی اہم مباحث پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے، اعداد و شمار کے گرافوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ۵۶۳ مدارس میں ۲۹۱ دیوبندی ۱۲۴ بریلوی ۴۷ اہلِ حدیث ۱۵ شیعہ اور بلاتخصیص مسلک تعداد ۸۶ ہے۔ قبل پاکستان مدارس کی تعداد ۱۳۷ تھی۔ اس کے بعد جائزہ کی رو سے یہ تعداد ۸۹۳ ہو چکی ہے۔ ان مدارس میں پنجاب میں طلباء کی تعداد ۲۱۴۶۵ ہے (اس کثرت کی وجہ شاید ملحقہ سکول اور کالجوں کی کثرت ہے) سرحد میں ۷۷۴۵، سندھ میں ۴۱۷۳، بلوچستان میں ۱۰۰۱ ہے۔ مغربی پاکستان کے طلبۂ مدارس کی کل تعداد پچھلی رپورٹ میں ۴۰۲۳۹ تھی۔ زیر نظر میں ۴۵۲۳۸ ہے اس میں مشرقی پاکستان کے ۲۸۶ اور بیرون ممالک کے ۱۳۴۰ طلبہ ہیں۔ ان مدارس کے کتب خانوں میں ۵ لاکھ چھ ہزار پانچ سو اکیاسی کتابیں ہیں جن میں اہم قلمی کتابیں ۴۶۵۴ ہیں، ۲۶ مدارس کی مہیا کردہ قلمی فہرستوں سے اہم کتابوں کی تفصیل بھی شریک کتاب ہے جبکہ اس سلسلہ میں مزید جد وجہد اور تعاون کی ضرورت ہے۔ ان مدارس سے ۲۷ مجلات یا جرائد شائع ہوتے ہیں جن کے پتے اور فون نمبر بھی درج ہیں۔

پچھلے سال ۱۳۹۱ھ میں ان مدارس کی سالانہ مجموعی آمدنی اکیاسی لاکھ ستاون ہزار چار سو چھ روپے تھی اور خرچ اٹھتر" لاکھ تراسی ہزار تین روپے جس سے ایک طرف ملک کے دردمند اہلِ خیر مسلمانوں کے دین کیلئے انفاق کا جذبہ عیاں ہوتا ہے۔ تو دوسری طرف یہ بھی کہ اتنے وسیع وعریض علمی نظام میں کتنی کفایت شعاری اخلاص اور قناعت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ سرکاری سطح پر اتنا کام کم از کم دس کروڑ روپے میں پورا ہوتا۔ پھر اتنی رقم کے صلہ میں ملک کو ہزاروں علماء، حفاظ، قراء، مدرسین، مبلغین، ائمہ، خطباء کا مہیا ہونا نہ صرف تعجب انگیز بلکہ اسلام کا معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ دار العلوم دیوبند کی مثال سامنے ہے اس نے پورے عالمِ اسلام کو کیا کچھ نہیں دیا ؟ مگر مہتمم دار العلوم دیوبند کی صد سالہ رپورٹ کی رُو سے۔ صد سالہ مدت میں۔ فضلاء دار العلوم پر نِکس تیرہ سو چودہ /۱۳۱۴ روپیہ خرچ آیا۔ گویا اتنی رقم میں اشرف علی تھانوی جیسے حکیم الامۃ، حسین احمد مدنی جیسے شیخ الاسلام اور مجاہدِ اعظم تیار ہوئے، اور کیسے کیسے مرشدین ومصلحین، مصنفین، مدرسین، قائدین، مبلغین شعراء، حکماء ملت اسلامیہ کو میسر آئے جس سے پوری اسلامی دنیا مالامال ہو گئی۔[ف]

ایک باب دینی مدارس اور دنیوی تعلیم کا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدارس سے درسِ نظامی کے علاوہ کالج، ہائی، مڈل اور پرائمری سکول کے شعبے بھی ملحق ہیں۔ ۹۰ مدارس میں السنۃ شرقیہ کے

[ف] اس صد سالہ عرصہ میں فضلاء کی تعداد ۷۴۱۷ ہے اور مجموعی طلبہ کی ۲۷۰۶۵ ہے۔ "س"

امتحانات برائے یونیورسٹی کی تیاری کرائی جاتی ہے ان مدارس کے کل اساتذہ کی تعداد ۳۱۸۶ ہے جن میں ۲۳۳۱ مدارس عربیہ کے اور ۵۲۳ دیگر عصری ـــــ سندات کے حامل ہیں۔ اس باب سے یہ غلط فہمی زائل ہوسکتی ہے۔ کہ مدارس عربیہ دینی تعلیم کے لئے مخصوص ہیں، اور دنیوی تعلیم سے نفرت ہے۔ گو اہم ترین مقصد دینی تعلیم ہی ہونی چاہئے، صنعتی فنی اور عصری علوم کے انتظامات سے ایک دنیا بھری پڑی ہے۔ اس لئے تبصرہ نگار کی رائے میں ان چیزوں کی حیثیت علماء اور ارباب مدارس کی نگاہ میں بہرحال ثانوی ہی رہنی چاہئے۔ اور عصری تعلیم گاہوں میں اسلامی علوم کو اولین نہیں تو مساوی حیثیت بہرحال دینی چاہئے۔ کجاکہ اسے تیسرے درجہ میں بھی جگہ نہ ملے اپنے دانست کے مطابق درس نظامی کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کے بعد مصنف نے انصاف اور حقیقت بینی سے کام لیکر دعوٰی کے ساتھ کہا ہے کہ تمام سرکاری تعلیم گاہوں یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں اب بھی درسِ نظامی زیادہ جامع دور رس متنوع اور ژرف نگاہی پر مبنی ہے۔ پھر اس کے دلائل لکھے ہیں۔ سرکاری نظامِ تعلیم میں یونیورسٹی کے امتحان میں بھی خلاصوں، کلیدوں بلکہ آزمائشی پرچوں کے رٹنے کا سہارا لیا جاتا ہے۔ مدارسِ عربیہ میں ایسی کسی چیز کی گنجائش نہیں یہاں مطالعہ کی وسعت اور گہرائی ہے، تعلیم عبادت سمجھی جاتی ہے۔ مقصد دین کی اشاعت اور رضائے الٰہی ہے جس نے طلبہ کو نشست و برخاست تدریس وغیرہ تمام امور میں اساتذہ اور بزرگوں کے ادب و احترام، عقیدت و عظمت میں رنگ دیا ہے۔ گو اب ایسی چیزیں نئے تمدن و تہذیب کی یلغار کی گرفت میں آنے لگی ہیں

مدارسِ عربیہ کی تنظیم ایک اہم ترین ضرورت ہے۔ جزوی طور پر ایک حد تک وفاق المدارس العربیہ نے اس کی طرح بھی ڈالدی ہے، جسکی سرگرمیوں میں بدقسمتی سے دن بدن کمی آرہی ہے، فاضل مؤلف نے ایک باب میں اس کی ضرورت، امکانات، بنیاد، اور مشترک اقدار پر روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح مدارس کے ابنائے قدیم کا باہمی ربط وضبط اور تنظیم بھی ایک اہم ضرورت ہے۔ ایک مفید بات یہ معلوم ہوجاتی ہے۔ کہ درسِ نظامی کے ۲۰ علوم کی کل ۸۶ کتابوں کے صفحات کی تعداد اوسطاً ۱۷۸۴۴ ہے۔

ـــــ بہرحال یہ سب کچھ جائزہِ مدارس عربیہ اور مصنف کی ہمہ جہتی مساعی کا ایک سرسری خاکہ ہے، ۷۲۰ صفحات پر پھیلی ہوئی یہ معلوماتی کتاب تمام علمی و فکری حلقوں بالخصوص مدارسِ عربیہ اور اس سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں کی معلومات کی ایک دنیا فراہم کرتی ہے۔ اور اہل علم و مدارس کو ایک نیا ولولہ جوش اور حوصلہ عطا کرتی ہے ـــــ واقعی مدارس اور مکاتب کی تعداد بلاشبہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ خدا کرے مؤلف محترم بہت جلد نقش ثالث کی شکل میں اس سے بھی جامع اور مکمل جائزہ پیش کرسکیں ان سے خدا نے اس سلسلہ میں ایک فرد کا نہیں بلکہ ایک ادارے اور اکیڈمی کا کام لیا ہے۔ ■■

★ اختر راہی۔ ایم۔ اے
★ سمیع الحق

بائبل سے قرآن تک۔ (جلد سوم) | مؤلف مولانا رحمت اللہ کیرانوی ؒ۔ مترجم :۔ مولانا اکبر علی صاحب
شرح و تحقیق۔ مولانا محمد تقی عثمانی۔ ناشر : مکتبہ دار العلوم کراچی ۱۴۔ کتابت وطباعت عمدہ۔ جلد خوشنما
مضبوط۔ صفحات : ٦٦٤۔ قیمت : ۱۵ روپے صرف۔

برصغیر پاک وہند میں قدم جماتے ہی اہل صلیب نے عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ سرکاری سرپرستی میں اہل ہند کے دین و ایمان بگاڑنے کی کوششیں ہونے لگیں مگر اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اور مردانِ مجاہد خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے بیشتر فانڈر نامی ایک پادری برصغیر کے شہروں میں دندناتا پھرتا اور ہر جگہ مسلمان علماء کو دعوتِ مبارزت دیتا۔ کئی علماء نے اس کو دندان شکن جواب دیئے۔ مگر آگرہ میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی ؒ سے مناظرہ میں شکست کھاتے کے بعد ملک چھوڑ کر چلا گیا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ پادری فانڈر پھرتا پھراتا ترکی جا نکلا۔ سلطان عبد العزیز کی درخواست پر ترکی گئے اور پادری فانڈر کو دوبارہ میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

سلطان عبد الحمید کی تحریک پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے پادری فانڈر کی بدنام زمانہ کتاب۔ "میزان الحق" کے جواب میں مدلل اور محققانہ کتاب "اظہار الحق" رقم کی۔ اس کتاب کے تراجم دنیا کی اہم زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ۱۸۹۱ء میں اس کا انگریزی میں ترجمہ ہوا تو ٹائمز آف لنڈن (Times of London) نے لکھا "اگر لوگ یہ کتاب پڑھتے رہے تو دنیا میں عیسائی مذہب کی ترقی رک جائے گی۔"

اسی اہم اور تاریخی کتاب کا ترجمہ مولانا اکبر علی صاحب نے "بائبل سے قرآن تک" کیا ہے۔ اس کی پہلی جلد پر الحق میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ زیرِ نظر تیسری جلد پانچویں باب کی فصل دوم اور چھٹے باب پر مشتمل ہے۔

پانچویں باب کی دوسری فصل میں عیسائی پادریوں کے احادیث پر درج ذیل پانچ اعتراضات کے جواب لکھے ہیں :

۱. راوی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار تھے۔

۲. محدثین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے سو دو سال بعد احادیث قلمبند کریں۔

۳. بعض احادیث خلافِ واقعہ ہیں۔

۴. احادیث قرآن کی مخالفت کرتی ہیں۔

۵. احادیث میں باہم اختلاف پایا جاتا ہے۔

مولانا کیرانوی نے متذکرۃ الصدر اعتراضات کے جوابات خود بائبل ہی سے دئے ہیں۔ اور ضمنی طور پر کئی اہم موضوعات پر پھول بکھرتے گئے ہیں۔

چھٹے باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت پر دلائل دئے ہیں۔ اولاً انہوں نے جو پیش گوئیاں کیں وہ درست ثابت ہوئیں۔ اس سلسلے میں تینتیس ۳۲ پیش گوئیاں ذکر کی ہیں۔ ساتھ ہی بائبل کی پیش گوئیاں بیان کر دی گئی ہیں جو غلط اور جھوٹی ثابت ہوئیں۔

ثانیاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چالیس معجزات پیش کئے ہیں۔ اور ان پر پادریوں کے اعتراضات کا رد کیا ہے۔ معراج النبی اور معجزہ شق القمر پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

ثالثاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند اخلاق کو بطورِ حجت پیش کیا ہے۔ اور اسلامی شریعت کی بقا بھی حقانیت کی دلیل ہے۔

رابعاً کتبِ سماویہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بشارتوں پر مفصل کلام کیا ہے۔ آخر میں پادریوں کے پانچ اہم اعتراضات کے تار و پود بکھیرے گئے ہیں۔

مولانا اکبر علی صاحب کی اس تاریخی کتاب کا ترجمہ سلیس اور رواں ہے۔ مولانا محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ نے شرح و تحقیق کا اعلیٰ معیار پیش کیا ہے، مثال کے طور پر استثنا، کی پیش گوئی پر فکر انگیز تحقیق اور انجیل برناباس کے تعارف میں حیرت انگیز انکشافات اُن کی جگر کاری اور دماغ سوزی پر دال ہیں۔ مولانا کیرانوی نے تو روانیٔ تحریر میں محض روایات پیش کرنے پر اکتفا کیا۔ مگر مولانا عثمانی کی تلاش و جستجو نے ان موتیوں کو سطح سمندر سے نکال کر ہتھیلی پر رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف، مترجم اور شارح کی محنت قبول فرمائے۔ آمین

آخر میں کتاب کا انڈکس ہے، جس سے کتاب کی قدر دہ چند ہو گئی ہے ــــ کتاب اس قابل ہے کہ ہر لائبریری کی زینت بنے اور ہر اہلِ علم اس سے استفادہ کرے۔

شراب خانہ خراب | مؤلف : محمد اجمل ۔ طباعت : آفسٹ ۔ صفحات ۳۶ ۔ قیمت درج نہیں
ناشر : مکتبہ اشاعت اسلام جامع مسجد رحمانیہ ۔ عبدالکریم روڈ قلعہ گوجر سنگھ لاہور ۔
جناب مفتی محمود صاحب مدظلہ العالی وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد نے عنان حکومت سنبھالتے ہی سرحد میں شراب پر پابندی عائد کر دی ۔ ان کا یہ عمل عوام کے دلوں کی آواز تھا ۔ دوسرے صوبوں میں بھی "ام الخبائث" پر پابندی عائد کرنا ضروری تھا ۔ اسی مقصد کے لئے علمائے اسلام اور درد مندان ملت نے شراب خانہ خراب کی تباہیاں واضح کیں ۔ لاہور کے ممتاز خطیب مولانا محمد اجمل نے اس موضوع پر قرآن و سنت کے احکامات پیش کئے ہیں ۔ نیز اسلامی نظام تعزیر میں شراب نوشی کی سزا پر بحث کی ہے ۔ (اختر راھی)

★

شمس العرفان | حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے خلیفہ اجل حضرت شاہ غلام علی صاحب مجددی (وفات ۱۲۴۰ھ) کے ملفوظات قدسیہ کو ان کے خلیفۂ ارشد شاہ رؤف احمد صاحب نے ۱۲۳۱ھ میں دارالمعارف کے نام سے فارسی زبان میں قلمبند کیا تھا ۔ اس خانوادۂ ارشاد و سلوک سے وابستہ ایک فرد فرید مولانا حافظ قاضی عبدالکریم صاحب کلاچی نے نہ صرف ان ملفوظات میں سے ۲۹ گرانمایہ ملفوظات کا اردو ترجمہ کیا بلکہ حاشیہ میں اسکی عارفانہ اور عالمانہ تشریح بھی فرمائی ، ان اکابر کے علوم و معارف کی تشریح یا تسہیل اور ترجمہ ایک اہم خدمت ہے ۔ حق تعالیٰ مؤلف کتاب اور ناشر نجم المعارف کلاچی کے حق میں عظیم الشان صدقۂ خیر بنا دے اور لوگوں کو حکمت و معرفت کے ان موتیوں سے مالا مال ہونے کی توفیق دے ۔ کتاب کے ۹۰ صفحات ہیں ، قیمت ایک روپیہ ، ملنے کا پتہ :۔ مکتبۂ نجم المعارف کلاچی ، ڈیرہ اسماعیل خان ہے ۔

اسلام کا معاشی نظام | پروفیسر افسر حسن صدیقی امروہی ایم اے ، جن کی "اقتصادی منصوبہ بندی اور ترقی کے بنیادی اصول" پر قابل قدر انگریزی کتاب بی اے اور ایم اے کے طلبہ میں مقبول ہے ، اسلامی معاشیات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں ۔ پیش نظر کتابچہ کو فاضل مصنف نے مروجہ معاشی نظام تعلیم اور اصطلاحات کے نقطۂ نظر سے مرتب کیا ہے ۔ اس طرح کہ اسلامی معیشت کے خدوخال نمایاں ہو کہ طلبہ کو مروجہ مانوس معاشی اصطلاحات کے ساتھ اس کو سمجھنے میں بھی آسانی ہو ۔ عاملین پیدائش ، مبادلۂ دولت ، تقسیم دولت ، مالیات عامہ اور ان سے متعلق کئی ضمنی مباحث میں اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے ۔ بیشک اسلام نے دین و دنیا میں ایک معتدلانہ توازن قائم کیا ، رہبانیت کی بھی بیخ کنی کی مگر اس کے لئے ولا تنس نصیبک من الدنیا سے یہ استدلال صحیح نہیں ہے کہ دنیا میں سے حصہ نہ بھولنے کا مطلب دنیا کے پیچھے پڑنا ہے بلکہ وہاں مخاطب قارون ہے اور مقصد سرمایہ داری اور حد سے زیادہ دنیا پرستی سے روکنا ہے کہ دنیا کو صرف دنیا طلبی کا نہیں بلکہ

آخرت کا بھی ذریعہ بنا دو۔ بہرحال فاضل مؤلف نے بڑی محنت اور عرقریزی سے کتابچہ مرتب کیا ہے اور نئے طبقوں میں اسلامی معاشیات کے تعارف کرانے کے ایسے مساعی قابلِ قدر ہیں۔ صفحات ۱۷ اور قیمت دو روپے ہے ــــ ملنے کا پتہ قمر کتاب گھر اردو بازار کراچی۔

اذانِ سحر | صفحات ۱۴۰، قیمت ۲/۵۰ روپے، ناشر عزیزیہ پبلی کیشنز ۵۶ میکلوڈ روڈ لاہور

قائدِ جمعیۃ مولانا مفتی محمود صاحب وزیرِ اعلیٰ سرحد کی شخصیت جامع صفات و کمالات ہے۔ ان کی کتابِ زندگی، علم و عمل، دین و سیاست، قیادت و امارت، فراست و بصیرت کا ایک حسین و جمیل البم ہے۔ اذانِ سحر میں ان کے کئی فکر انگیز انٹرویوز اور بصیرت افروز تقاریر کو یکجا کیا گیا ہے۔ قومی اسمبلی میں عائلی قوانین پر تنقیدی تقریر تو کتاب کی جان ہے۔ مفتی صاحب مدظلہٗ کی ہمہ گیر زندگی متنوع خدمات اور افکار و نظریات پر اس مجموعہ سے روشنی پڑے گی۔ جمعیۃ کو لٹریچر کے میدان میں بہت پہلے ایسی چیزوں کی ضرورت تھی، عزیزیہ پبلی کیشنز اب نہایت عمدہ ذوق کے ساتھ اس خلاء کو پُر کرنے کی کوشش کرنے لگا ہے۔ اور اسکی یہ اوّلین پیشکش "اذانِ سحر" ہر لحاظ سے تحسین کی مستحق ہے۔

اسلام کا نظامِ عبادت | نور محمد غفاری ایم اے، صفحات ۱۶۸، قیمت ۳/۵۰ روپے، ناشر شیخ محمد بشیر اینڈ سنز جلال الدین بلڈنگ چوک اردو بازار لاہور۔

اسلام کے تصوّرِ عبادت کا دیگر جاہلانہ تصورات سے موازنہ کے بعد نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جیسی اہم عبادات کے انفرادی اجتماعی سیاسی، معاشرتی مصالح اور ان عبادات کی اہمیّت پر سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ عام مسلمانوں کے ساتھ ایم اے اور بی ایڈ کے طلبہ کا افادہ بھی مؤلف کے پیش نظر ہے پہلے باب تصوّرِ عبادت کا اکثر حصہ علامہ سلیمان ندویؒ کے خطباتِ مدراس سے ماخوذ ہے۔ باقی حصے بھی بڑی محنت سے مرتب کئے گئے ہیں۔ اشاعت سے قبل شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہٗ سے نظرثانی کرائی گئی ہے۔ مؤلفِ کتاب کا تصنیفی میدان میں یہ نقشِ اوّل انشاءاللہ ان کی شاندار علمی خدمات کا پیش خیمہ ثابت ہوگا ــــ۔

تقاریر مجاہدِ ملّت | مولانا سید منظور احمد شاہ کہروڑی۔ صفحات ۱۱۲، قیمت ۲/۵۰ روپے، ناشر: خالد، طارق سید برادران خانقاہ مخدوم ملاموسی کہروڑ پکا، ضلع ملتان ــــ فدائے ختمِ نبوت بے نظیر مجاہد اور لاجواب خطیب، بطلِ جلیل مولانا محمد علی جالندھریؒ کی خطیبانہ کاوشوں اور معرکۃ الآراء تقریروں کی ایک جھلک اس کتاب میں نظر آئے گی۔ مولاناؒ کی ان تقاریر میں کئی اہم دینی مسائل پر عام فہم زبان اور چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑا کارآمد مواد موجود ہے، مرزائیت، دفاعِ پاکستان، کمیونزم وغیرہ پر خطبات جمع کئے گئے ہیں۔ (سمیع الحق)

■■

احوال وکوائف

دارالعلوم حقانیہ

مولانا سلطان محمود صاحب
ناظم دفتر اہتمام

نیا تعلیمی سال اور دیگر حالات ۱۰ ر شوال سے دارالعلوم کے نئے تعلیمی سال کیلئے داخلہ شروع ہوا جو طلبہ کے ہجوم کے باوجود صرف ۱۵ ر شوال تک جاری رہا ۔ وسائل کی کمی کی بناء پر داخلہ محدود رکھنے کے باوجود درس نظامی میں اب تک ملک و بیرون ملک کے طلبہ کی تعداد ساڑھے پانچ سو تک پہنچ چکی ہے ، دورۂ حدیث شریف کے طلبہ کی تعداد تقریباً ۱۷۰ ہے ۔ ۲۲ ر شوال کو دارالحدیث میں تمام اساتذہ اور طلبہ کی موجودگی میں ختم کلام پاک کے بعد حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے ترمذی شریف سے تعلیمی سال کا افتتاح کیا ، اور بعد میں علم کی فضیلت اہل علم کی ذمہ داریوں اور موجودہ حالات کے تقاضوں پر سیر حاصل تقریر فرمائی اس وقت تمام تعلیمی شعبے پورے جوش اور ولولہ سے مصروف کار ہو چکے ہیں ۔ ان تمام طلبہ کے قیام و طعام ، کتب ، روشنی ، صابن اور دیگر سہولتوں کا دارالعلوم متکفل ہے ۔ اسلامیہ مڈل سکول کے مقامی ۶ سو طلبہ کی تعداد مذکورہ تعداد اس کے علاوہ ہے حضرت شیخ الحدیث نے شوال میں جامعہ اسلامیہ کشمیر روڈ راولپنڈی صدر اور جامعہ اشرفیہ مسجد مہابت خاں پشاور کے نئے تعلیمی سال کا افتتاح بھی فرمایا ۔ ماہ رمضان میں دارالعلوم کی لائبریری کے لئے نئی زیر تعمیر عمارت کا نچلا حصہ مکمل ہو گیا ہے ۔ جسے احاطۂ قاسمیہ کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے ۔ اس حصہ میں ۵۳ طلبہ کی رہائش نکل آئی ہے ، اب بالائی حصہ کتب خانہ کی عمارت خدا کے کرم اور اہل خیر کی توجہ کی محتاج ہے ۔

خان عبدالولی خان کی آمد دارالعلوم میں ہر طبقۂ فکر کے واردین و صادرین کی آمد و رفت جاری رہتی ہے ۔ ۷ ر دسمبر کو نیشنل عوامی پارٹی کے رہنما خان عبدالولی خان صاحب ایک تعزیت کے سلسلہ میں اکوڑہ خٹک آئے تو حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق مدظلہ کی مزاج پرسی اور ملاقات کیلئے دارالعلوم بھی تشریف لائے صوبائی وزیر اطلاعات خان محمد افضل خان بھی ان کے ساتھ تھے ، دفتر اہتمام میں حضرت مدظلہ سے ملاقات اور بات چیت کے بعد دارالعلوم کے تمام شعبوں کا معائنہ کیا ، دفتر الحق میں بھی گئے ۔ اور سب کچھ دیکھ کر نہایت محظوظ ہوئے ۔ طلبہ کے قیام و طعام وغیرہ سہولتوں کی بناء پر آپ نے کہا کہ دارالعلوم تو واقعی معنوں میں ایک ویلفیئر سٹیٹ ہے ۔ تو ایک رکن دارالعلوم حاجی محمد یوسف نے کہا کہ یہ خدائی سٹیٹ ہے اس لئے یہاں امن و عافیت اور خوشحالی کا دور دورہ ہے ۔ طلبہ کی خواہش

پر خان عبدالولی خان صاحب نے دارالحدیث میں ایک برجستہ تقریر بھی فرمائی اور اس سے قبل مولانا سمیع الحق استاذ دارالعلوم نے آپ کو خوش آمدید کہا۔ خان عبدالولی خان صاحب نے اپنی جیب خاص سے دارالعلوم کو ایک سو روپے کا گرانقدر عطیہ بھی دیا کتاب الآراء میں اپنے تاثرات میں آپ نے لکھا کہ میں پہلی دفعہ دارالعلوم میں بادشاہ خان، دوبارہ مولانا بھاشانی کی معیت میں حاضر ہوا، اور آج تیسری بار۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دارالعلوم، دیوبند کی روایات اور شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ جیسے باعمل علماء کا کردار ادا کرتا رہے گا۔ خان صاحب موصوف نے جو تقریر فرمائی اس کا کچھ حصہ یہاں دیا جارہا ہے :

"محترم حضرت مولانا صاحب اور طالب العلم بھائیو ! اس دارالعلوم کے ساتھ باچا خان کا تعلق یقیناً بہت دیرینہ ہے۔ آپ سب حضرات کو یہ بات معلوم ہوگی کہ بادشاہ خان صاحب جب سیاست میں آئے تو سب سے پہلے آپ دیوبند گئے، اور اب تک دیوبند کے علماء اپنے عمل اپنے کردار اپنے اٹھنے بیٹھنے سے اپنی اسلامی تعلیمات سے اور قوم کی اصلاح و تربیت کے لحاظ سے اسلام کی اصل روح قائم رکھے ہوئے ہیں۔ تو بادشاہ خان نے اپنی سیاست کا آغاز دیوبند سے کیا۔ جیسا کہ ابھی میرے بھائی (مولانا سمیع الحق ایڈیٹر الحق) نے کہا امام الہند مولانا آزاد شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی مفتی کفایت اللہ جیسے اکابر ان کے ساتھی تھے۔ تو اس تحریک آزادئ ہند کے چلنے کا سرچشمہ دیوبند تھا، وہاں سے یہ چشمہ جاری ہوا۔ برطانوی سامراج کے مقابلہ میں یہی علماء دیوبند تھے کہ کافر فرنگی اور نوآبادیاتی سامراج کے مقابلہ میں اٹھے، شدائد برداشت کئے مسلمانوں میں جاکر بے خوفی سے لوگوں کو بیدار کیا بڑی خوشی کی بات ہے کہ دیوبند کی وہی روشنی اسی نہج پر یہاں (دارالعلوم حقانیہ ؒ) روشن ہے جس نہج پر خود دیوبند اس سے روشن تھا۔ افسوس کہ وہ دیوبند ہم سے جدا ہوگیا، مگر دیوبند ہی سے بڑے اکابر حضرت مفتی محمود صاحب یہاں ہمارے مولانا (عبدالحق) صاحب یا ان جیسے دوسرے اکابر یہ سب اس چراغ کی روشنی یہاں بھی روشن کئے ہوئے ہیں۔" خان عبدالولی خان صاحب نے طلبہ کو روئے سخن متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان بڑوں نے سیاسی جدوجہد اور ملک کی آزادی کیلئے جو پُرخار راستہ پکڑا تھا۔ آپ بھی اپنے عمل سے ثابت کر دکھائیں گے کہ آپ باعمل علماء میں سے ہیں، اور امید ہے کہ وہی روشنی آپکی تعلیم و کردار میں بھی نظر آئے گی۔ جو مولانا مدنیؒ مفتی کفایت اللہ، مفتی محمود اور خود ہمارے ان مولانا صاحب (حضرۃ شیخ الحدیث) نے اپنائی ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے درمیان کچھ اختلافات دشمنوں کیوجہ سے پیدا ہوئے تھے، مجھے اس پر افسوس ہے۔ مگر آج بڑی خوشی اور مبارکباد کی بات ہے کہ اسلام اور پشتو دونوں رشتوں نے علماء کے ساتھ پھر ملا دیا ہے۔ اس صدی میں پہلی بار ہمارے اور آپکے بزرگوں نے اس ملک کی خدمت کی باگ ڈور سنبھالی ہے۔ ہمارے اختلاف میں ملک کا نقصان تھا۔ آج یہ دو صوبائی حکومتیں اور دو پارٹیاں نیپ اور جمعیۃ ملک کی سلامتی اور اصول کیلئے میدان میں اتری ہیں اور سب کا مشترکہ فرض ہے کہ ان قوتوں کو اور بھی مضبوط کریں۔ بہرحال میں یہاں ایک تعزیت کیلئے حاضر ہوا تھا تو اپنا فرض سمجھا کہ حضرت مولانا صاحب کو بھی سلام کرتے جاؤں۔ یہ ہمارے بڑے ہیں اور میرے والد صاحب ان کے دوست ہیں، ان کی محبت تھی تو میں بھی انکی سنت جاری رکھنا چاہتا ہوں۔ ■■

کراچی میں ماہنامہ الحق

کراچی کے اہل علم طلباء مدارس عربیہ اور عام مسلمان ماہنامہ الحق، محمد رمضان عارف میمن، مدرسہ تعلیم الفرقان توحید نگر چاکی واڑہ کراچی ۲ سے حاصل کریں۔ اس کے علاوہ حسب ذیل ایجنسیوں یا بک سٹالوں پر بھی الحق دستیاب ہے:

۱۔ طاہر نیوز ایجنسی	۲۵ ہارون چیمبر کراچی
۲۔ طاہر بک ڈپو	ٹرام جنکشن صدر
۳۔ اقبال بک ہاؤس	″
۴۔ خان محمد بک ڈپو	″
۵۔ ماڈرن بک ڈپو	″
۶۔ عبدالغفور بکسٹال	″
۷۔ ایم۔ ایس نیوز ایجنسی	ریگل صدر
۸۔ لائٹ آف پاک اسٹال	برنس روڈ
۹۔ جنرل بک ڈپو	فریر روڈ
۱۰۔ نیو تاج بکسٹال	لی مارکیٹ
۱۱۔ کوہ نور بکسٹال	″
۱۲۔ آزاد پاکستان بکسٹال	″
۱۳۔ عوامی بکسٹال	بولٹن مارکیٹ
۱۴۔ سراج بکسٹال	چھوٹا میدان ناظم آباد
۱۵۔ غلام مصطفیٰ بکسٹال	″
۱۶۔ فرنٹیر بکسٹال	شیر شاہ کالونی

الحق کے لئے لکھے جانے والے مضامین کا مسودہ خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف لکھا ہونا چاہئے۔ مسودہ صاف ستھرا ہو تو مضامین کی عمدہ ترتیب اور خوبصورت کتابت میں بڑی مدد ملتی ہے۔ مضامین یا تبصروں کی اشاعت ادارہ کی صوابدید پر ہو گی۔

"ادارہ"